ترتیب :
باقر مہدی

چوتھی کتاب : اگست ۱۹۷۸ء

ناشرین : باقر مہدی ، یعقوب راہی

کتابت : ابراہیم نذیر سرورق : عادل منصوری

قیمت : ۲۵ روپے

خط و کتابت کا پتا : ۱۰۸، موتی شاہ لین، مجگاؤں، بمبئی ۴۰۰۰۱۰

تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بمبئی ۳، دہلی ۶، نئی دہلی ۲۵، علی گڑھ ۱

عزیز ، اسکیچ : خلیل الرحمان اعظمی، راجندر سنگھ بیدی ، سریندر پرکاش ۔
ساجد رشید ، اسکیچ : انور عظیم ۔
آصف ، اسکیچ : قرۃ العین حیدر ۔
نیّر مسعود ، اسکیچ : نیّر مسعود ۔
چارلس وہائٹ ، ڈرائنگ : صفحہ ایک
عباس صباحت : تصویریں ، وارث علوی، زبیر رضوی، ظ۔ انصاری اور یعقوب راہی

اظہار کی کتابت میں جناب رشید حسن خاں کی ہدایات ( اردو املا ) کا بڑی حد تک خیال رکھا گیا ہے ۔

## وارث علوی



## راجندر سنگھ بیدی



## انور سجاد

## تین افسانے



## نظمیں

## ایمرجنسی

ورق ورق



## غزلیں

## سفرنامہ



## بازیافت ــ عزیز احمد



## یادِ رفتگاں

## تین مضامین



## سات کالی غزلیں



## تبصرے



## خطوط

تعارف
ایک خط

سازشی
گلے
کیکر
سنڈریلا
پرندے کی کہانی
کونپل
مکھی کا مونولاگ — داستانِ انور سجاد
یوسف کھوہ — یوسف کامران
رات کا سفر
ایک ٹی۔ وی۔ ڈراما: — انور سجاد کا نامکمل ایکس رے
رات کا پچھلا پہر — ایم۔ شریف

چور دروازہ
سرمد صہبائی

جدید تخلیق — 'چوراہا' کا اختتامیہ
پنڈارے اور عہدنامہ — انیس ناگی

انور سجاد کا فن
افتخار جالب

# تعارف

| | |
|---|---|
| نام | انور سجاد |
| والد کا نام | سید دلاور علی شاہ |
| تاریخ پیدائش | ۲۷ مئی ۱۹۳۵ء |
| مقام پیدائش | لاہور |
| پتا | 'نشیمن' چونا منڈی، لاہور ۸ |
| تعلیم | بی۔ایس سی (پنجاب یونی ورسٹی) ایم۔بی۔بی۔ایس، میڈیکل کالج لاہور، ڈی ٹی ایم اور ایچ، لیور پول یونی ورسٹی (انگلستان) |
| پیشے | ڈاکٹری، خامہ فرسائی، اداکاری۔ |
| مشغلے | مصوری اور موسیقی، کئی بار مصوری کی نمائشیں (ONE MAN SHOW) |
| کتابیں | رگِ سنگ (ناولٹ) ۱۹۵۹ء، چوراہا (افسانے) ۱۹۶۴ء، استعارے (افسانے) ۱۹۷۵ء سرخ بالوں والی لڑکی (ٹی وی کھیل) زیرطبع، مضامین (زیرطبع) |

---

انور سجاد ایک فن کار ہی نہیں بلکہ ایک باعمل سیاسی کارکن بھی ہے۔ مزدوروں اور فن کاروں کی ٹریڈ یونینیں بنا چکا ہے اور لاہور کی آرٹ کونسل کا صدر بھی رہ چکا ہے۔ حال ہی میں فوجی حکومت نے انور سجاد کو ۲۰ دسمبر ۱۹۷۷ء سے ۶ جنوری ۱۹۷۸ء تک جیل میں رکھا تھا۔

انور سجاد دوسری بار ۷ مارچ ۱۹۷۸ء کو گرفتار کیے گئے اور ۲۴ اپریل ۱۹۷۸ء تک مقید رہے۔

'اظہار' ان کی گرفتاری پر پُرزور احتجاج کرتا ہے۔

## انور سجّاد

# سیلف پورٹریٹ

آپ کا حکم ہے کہ اپنی ، سیلف پورٹریٹ بھیجوں ۔ پتا نہیں کیوں ، اپنے بارے میں لکھنے سے ہمیشہ کترایا ہوں ۔ کوشش کی بھی ہے ایک آدھ تو ایک آدھ صفحے کے بعد ترک کردی ۔ شریف اور یوسف نے میری کم زوریوں (اچھائیوں؟) کی طرف بہت واضح اشارے کیے ہیں ۔ باقی جو میں ہوں وہ کہانیوں میں ہوں ، ڈرامے میں ہوں ، کیا ڈرامے کہانیاں ہمارا اپنا ہی پرتو نہیں ہوتے ـــــ ؟ شدت سے چاہتا ہوں ، شدت سے نفرت کرتا ہوں ۔ اچھی موسیقی اس لیے اچھی نہیں لگتی کہ برداشت نہیں کرپاتا ، فوراً کوئی نہ کوئی (مزید) نشہ کرنے کو جی چاہتا ہے ۔ نشہ کروں تو (بدمستی میں؟) ناچنے کو جی چاہتا ہے ۔ (تنہا ہوتا ہوں تو یہ حرکت بھی سرزد ہوجاتی ہے) اچھی لڑکیاں ، بہت اچھی لگتی ہیں ـــ اچھی باتیں کرنے والی ، اچھے جسم والی ـــ (سوکھی سڑی نہیں) نشے میں بعض غیر اچھی چیزیں بھی اچھی لگتی ہیں ۔ اچھی چیزیں ، ذرا اور نشہ بڑھے ، تو اور اچھی لگنے لگتی ہیں ، جب اور نشہ بڑھتا ہے (اور یہ بہت کم ہوتا ہے) تو سب کچھ زہر لگنے لگتا ہے ۔ اپنا آپ بھی ، بالآخر رونے کو جی چاہنے لگے تو نیند آجاتی ہے ۔ اگر رتّی (میری بیوی) اتنی UNDER STANDING نہ ہوتی تو کب کا ، شادی کے بعد ـــ مرکھپ گیا ہوتا ۔ اور اگر میری امّی اتنی UNDERSTANDING نہ ہوتیں تو ابا کی سخت طبیعت (جبر) کی وجہ سے شاید TEENS ہی میں کہیں انتقال فرما گیا ہوتا ۔ ان دونوں FEMALE FORCES کے حوالے سے میں خاصا خوش قسمت ثابت ہوا ہوں ۔ باقی تمام ذاتی یا اجتماعی زندگی جو ہے ان ہی کی وجہ سے ہر زم سے گزرتی روشنی کی طرح بکھری ہے ، سمٹی ہے ـــ کتنی مختصر سی پورٹریٹ ہے میرے سیلف کی ۔

---

لہ انور سجّاد کے ایک خط سے اقتباس ۔ (باقر مہدی کے نام)

"..... انور سجّاد کے افسانوں کی تفہیم کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ نیا افسانہ کسی واقعے کے ڈرامائی اظہار کا افسانہ نہیں ہے بلکہ "شعور کی آنکھ" کا اظہار ہے۔ تصادم، تناظر اور متخالف واقعات کا مونتاژ ہے۔ مصوّر کی حیثیت سے انور سجاد نئے نئے رنگوں کے انوکھے امتزاج کے تجربات کرتا ہے۔ وہ ایک حسّاس شاعر بھی ہے اس لیے اس کی زبان شعری پیکروں اور غنائیت سے پُر ہوتی ہے اس کے افسانے سرمایہ دارانہ سماج کے جدید آدمی کی ایسی کیفیات کا علامتی اظہار ہیں جن سے فرار ممکن نہیں ہے ..... انور سجّاد جدید افسانے کا روحِ رواں ہے"

باقر مہدی

"اردو افسانے کے بیتے سال ۷۵-۱۹۵۵ء" کا ایک اقتباس

# سازش

انور سجّاد

ہم دنیا جہان کی باتیں کرتے، سارا دن مٹی کی ٹوکریاں اُٹھا اُٹھا کر ٹرکوں میں ڈالتے رہے۔ ہم آزاد تھے، صرف ایک دوسرے کو دیکھ کر یاد آتا تھا کہ ہم قید میں ہیں۔

ہم چھوٹے سے ٹیلے پر سستانے کے لیے بیٹھے تھے۔ ہوں، ہم نے سوچا، ہم نہر کھود رہے ہیں۔

ہوں!

ہم سورج کی آخری کرن تھامے بند لاری میں بیٹھے لوٹ رہے تھے اور اپنے جسم پر بھاگتی ہوئی نیلی پیلی سلاخوں کو دیکھ رہے تھے۔

روشنیاں۔

روشنیوں کے سیلاب میں نوجوان لڑکیاں نظر آئیں۔ لاری کی رفتار کم ہوگئی۔ ہم نوجوان مسکرائے۔ بوڑھا سنجیدہ ہوگیا۔ تانگے میں پچھلی گدی پر بیٹھی لڑکیوں نے اپنے سینے پر گرم گرم چادریں سرکا دیں۔ بوڑھا مسکرایا۔ ہم نے کہا!

— لڑکیاں

ایک نے کہا

— آہ .... بمبیئے ..... یہ سب سالا ہوچ پوچ ہے۔ وہاں اپنا کھولی یہاں کے شیش محل سے بہت اچھا تھا۔

ہم نے سوچا یہ نہر مکمل کب ہوگی۔

— قیدی

تانگے کی پچھلی گدی پر ایک لڑکی نے دوسری سے کہا۔ ہم حیران رہ گئے۔ لاری تانگے سے آگے بڑھی۔ تانگہ میلوں پیچھے رہ گیا۔ ہم پھر روشنی کی لکیروں کا پیچھا کرنے لگے۔ ہم سب جانتے تھے کہ یہ لکیریں ہمیں کہاں لے جائیں گی۔ ہم نے سلاخوں سے دیکھا۔
ایک نے کہا

ــــ میرا شہر

دوسرے نے آنکھیں بند کرلیں۔

ــــ دلی چاندنی چوک

ــــ امرتسر..... نان قلچے، باقر خانیاں، ہال بازار، دربار صاحب۔

ــــ سکھ دا پتر

تیسرے نے مجھ سے بیڑی مانگ کر سلگائی۔

ــــ لاہور لاہور اے۔ بھاٹی لوہاری، موچی۔

بوڑھا مسکرایا۔

ــــ تم کہاں تھے۔

ــــ میں؟

اس کی مونچھیں نئی نئی پھوٹی تھیں۔

ــــ میں.....؟ میں کہاں ہوں؟

ــــ ہم سب ہنس پڑے۔ وہ جھینپ گیا اور ہمیں بھی اپنے ساتھ لے ڈوبا۔

ــــ میں موہنجو ڈارو میں تھا

بوڑھے نے کہا۔

ــــ ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

ــــ موہنجو ڈارو میں؟

ــــ ہاں

بوڑھے کے چہرے پر جھریاں اور بھی گہری ہوگئیں۔ آنکھوں میں بجھتی چمک بھڑکی۔

ــــ لیکن وہ تو بہت قدیم زمانے کا شہر ہے۔

ــــ کیا میں قدیم نہیں ہوں؟

— !

— یہ وہی شہر ہے ، جہاں سے وہ رقاصہ ۔

— ہاں ۔

— لیکن وہ تو معدوم ہو چکا ہے ۔ ایک زمانے کی بات ہے ۔

— ہر شے معدوم ہو چکی ہے ، ایک زمانے کی بات ہے ۔ بوڑھے نے آنکھیں جھپکیں۔

ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ہم نے سلاخیں تھام لیں ۔

بوڑھا ہنسا

— وہ مشہور رقاصہ میری بیوی تھی ۔

اس نے آہ بھری ۔

— میرا شہر ۔

ہم سب کو سانپ سونگھ گیا ۔

پھر میرے قریب بیٹھا وہ لڑکا جس کی مونچھیں نئی نئی پھوٹی تھیں یک لخت چیخا ۔

— جھوٹے تم سب جھوٹے ہو ۔ ہم سب کھوئے ہوئے ہیں ۔ ہم سب نہیں ہیں جھوٹے مکار بڈھے ۔

اس نے بوڑھے کو داڑھی سے پکڑ لیا ۔ پہرے دار لپکے ۔ لڑکے کی آنکھوں میں خون اُبلا ۔ جھاگ بنا ۔ ہم نے ایک دوسرے سے پوچھا ۔

— بھلا یہ کیسا بچکانہ حرکت تھی ۔

جب پہرے دار لڑکے کو لے گئے تو ہم میں سے ایک نے سرگوشی کی ۔

— یہ اس مشہور رقاصہ کا حرامی بچہ ہے ۔

ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی ۔

ہم سارا سارا دن مٹی کی ٹوکریاں اُٹھا اُٹھا کر ٹرکوں میں ڈالتے رہتے ہیں ۔

چپ چاپ ۔

ہم قیدی نہیں ہیں ۔ صرف ایک دوسرے کو دیکھ کر یاد آتا ہے کہ ہم قید میں ہیں۔

ہمارے ہونٹوں پر خاموشی کی مہریں ہیں ۔

ہم چھوٹے سے ٹیلے پر ستانے کے لیے بیٹھے ہیں ۔

—— اٹھو اٹھو کام کرو ۔ بھاگنے کی سوچ رہے ہو ؟ سازشی !
ان میں سے ایک آکے غرایا ہے ۔
ہماری چپ سازش ہے اور ہم سوچتے رہتے ہیں کہ یہ نہر کب مکمل ہوگی۔

○

## باقر مہدی کا چوتھا شعری مجموعہ

اِس میں ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۸ء تک کی نظمیں اور غزلیں شامل ہوں گی

(زیرِ طبع)

ناشر مکتبۂ اظہار — ۱۰۸ موتی شاہ لین، مجگاؤں، بمبئی ۴۰۰۰۱۰

انور سجاد

# گاے

ایک روز انھوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ اب گاے کو بوچڑ خانے میں دے ہی دیا جائے۔

—اب اس کا دھیلا نہیں ملنا۔

ان میں سے ایک نے کہا تھا۔

—ان مٹھی بھر ہڈیوں کو کون خریدے گا۔

—لیکن بابا مجھے اب بھی یقین ہے۔ اگر اس کا علاج باقاعدگی سے۔

—تم چپ رہو جی۔ بڑے آئے عقل والے۔

نکا چپ کر کے ایک طرف ہوگیا تھا اور بابا اپنی داڑھی میں عقل کو کریدتا ہوا اس کے بڑوں کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔

میں جب زبان ہلاتا ہوں تو یہ بوچڑ بن جاتے ہیں جس روز سے میں نے اپنی کو پہچانا ہے اسی روز سے چتکبری کو بھی جانا ہے اور جس دن سے یہ لوگ اسے بوچڑ خانے لے جانے کی سوچ رہے ہیں اس دن سے ہر لمحہ یتیم ہوتا ہوں یتیم ہوتا ہوں میں کیا کروں یہ سب مجھ پر ہنستے ہیں کہ میں اس کی اتنی خدمت کیوں کرتا ہوں ان ہڈیوں سے اتنا پیار کیوں کرتا ہوں کیوں کرتا ہوں۔

—آپ اسے بوچڑ خانے کے بجائے ہسپتال کیوں نہیں بھیج دیتے۔

نکے سے رہا نہیں جاتا تھا۔

—تم نہیں سمجھتے یہ ٹھیک نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاج پر پیسہ خواہ مخواہ کیوں برباد

کیا جائے ۔

میں ناسمجھ ہوں ! ابھی کل ہی ماں نے دھاگے میں پندرھویں گرہ لگائی ہے ۔

—— آپ علاج کرا کے دیکھیں تو سہی ۔

—— بڑوں کی باتوں میں دخل نہ دیا کرو ۔

میرا جی چاہتا ہے کہ میں —— آپ سب کو بوچڑ خانے دے آؤں ۔

پھر سب نے مل کر گلے کی زنجیر پکڑی تھی ۔ لیکن جیسے گائے کو بھی سب کچھ معلوم تھا ۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی تھی ۔ انھوں نے مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا تھا ۔ نکا ایک طرف کھڑا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا ۔ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا ۔

شاباش میری چتکبری میری گائے میری گئو ماتا ، ہلنا نہیں تم نہیں جانتیں یہ لوگ تمھارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں جانا نہیں ہلنا نہیں ورنہ ورنہ نہیں تو ۔

گائے اپنی جگہ پر اڑی ، مڑ مڑ کے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی ۔ ذرا ہٹ کر گائے کا بچھڑا کھونٹے کے ساتھ رسی سے بندھا بے تعلق بیٹھا تھا ۔ ہڈیوں پر لاٹھیوں کی بوچھار اسے نہیں سنائی دیتی تھی ۔ نکے کے کان بھی بند ہو رہے تھے ، رفتہ رفتہ ۔

سارے بزرگ ہانپتے ہوئے پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے ۔ پھر فیصلہ ہوا تھا ۔ کہ اگر یہ اب چل بھی پڑے تو ممکن ہے راستے میں کھبا ہو جائے اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے ٹرک میں ڈال کر لے جایا جائے ۔ ٹرک میں تو اسے اٹھا کر بھی لادا جا سکتا ہے ۔

اگلے روز ٹرک بھی آ گیا تھا ۔

ٹرک کی آواز پر گائے نے مڑ کے دیکھا تھا ۔ آنکھیں جھپکی تھیں اور پھر کھرلی میں منہ ڈال دیا تھا ۔ جہاں نکا چارا ڈال کے ابھی ابھی ٹرک کو دیکھنے گیا تھا ۔

—— آپ لوگ اسے واقعی ۔

اسے یقین نہیں آتا تھا ۔

—— نہیں تو ہم مذاق کر رہے ہیں کیا ؟

ایک نے کہا تھا ۔

—— بابا ، یہ گائے مجھے دے دو ۔ میں اسے ۔

— حکیم کی اولاد ۔
دوسرے نے کہا تھا ۔
— بابا اس کے بغیر ہیں ۔
— مجنوں کا بچہ
تیسرے نے کہا تھا ۔
چوتھا پانچواں سارے بزرگ سارے بزرگ سالے ایک سے ہیں اور بابا جو اپنی داڑھی کو عقل کا گڑھ سمجھتا ہے جانے اسے کیا ہو گیا ہے ۔
— بیٹے ٹرک والے کو دس روپے دے کر بھی ہم بہت فائدے میں رہیں گے ۔
او ۔ کمبخت سوداگر مجھ سے لو روپے مجھ سے یہ لو لیکن میری مٹھی میں تو اس وقت ہوا ہے جب، جب میں بڑا ہو جاؤں گا ۔
ہا ہا ہا ہا ۔
جب میں کمانے لگوں گا ۔
ہا ہا ہا ہا
تب تب تک تو چنگبری کی ہڈیوں کا سُرمہ بن گیا ہوگا میں میں کیا کروں ۔
ان میں سے ایک گائے کو لانے کھرلی کی طرف گیا تھا ۔ نکا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا ۔ یونہی دیکھنے کے لیے ۔ بڑے نے اس کی زنجیر کھولی تھی ۔ گائے نے کھرلی میں منہ مار کے دانتوں میں پٹھے دبائے تھے، مڑ کے نکے کو دیکھا تھا اور جانے کے لیے کھر اُٹھایا تھا ۔
— نہ ۔ نہ ۔ نہ
نکا چیخا تھا ۔
— بکومت ۔
گائے کھڑی ہو گئی تھی ۔
— ہے ۔ ہے ۔ ہے ۔ ہے ۔
بڑے نے زور لگایا تھا ۔
— نہ چنگبریے ۔ نہ ۔ نہ ۔
— چپ بھی کرو گے یا کھینچوں تمھاری زبان ۔

نکے نے زبان کو قید کر دیا تھا۔ بڑے نے پھر زنجیر کو جھٹکا دیا تھا۔

—— چلو میم صاحب! ٹرک والا تمھارے باپ کا نوکر نہیں جو سارا دن کھڑا رہے۔

گاے کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ زبان، قید میں پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔ لیکن وہ مشت استخواں وہیں کی وہیں تھی۔ نکا مسکرایا۔ پھر فوراً ہی اداس ہو گیا تھا۔

یہ تو یہ تو بک بھی چکی ہے اسے جانا ہی ہو گا مجھے اب بھی یقین ہے کہ اگر تھوڑی سی رقم لگا کے اس کا علاج باقاعدگی سے کیا جائے تو تو لیکن میں ان بزرگوں کا کیا کروں کاش میں حکیم ہی ہوتا اس بچھڑے کو شرم نہیں آتی ماں کے جسم پر نیل پڑ رہے ہیں اور یہ باہر کھڑا الو کے پٹھوں کی طرح دیکھے جا رہا ہے۔

زبان پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔

پھر ان میں سے ایک کو بڑی اچھی سوجھی تھی۔ اس نے گاے کی دُم پکڑ کر اسے تین چار بل دیے تھے۔ وہ پیٹھ کے درد سے دوڑ بھاگی تھی۔ اس نے نکے کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا تھا۔ پیٹھ کا درد گاے کو ہانکتا ہوا بالکل ٹرک کے پاس لے آیا تھا۔ نکے کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

در فٹے منہ، لعنت لکھ لعنت۔

ٹرک والے نے گاے کے چڑھنے کے لیے ٹرک سے زمین پر تختہ لگا دیا تھا۔ گاے نے تختے پر کھر رکھا۔

—— نہ چڑھنا۔

—— اس کی زبان کاٹ لو —— یہ گاے کو ورغلاتا ہے، ڈراتا ہے۔

نکا پھر منہ بند کر کے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ گاے نے پہلے تختے کو دیکھا۔ پھر نکے کی طرف۔

در فٹے منہ، لعنت لکھ لعنت۔

نکے کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔

اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا ہوں کیا کر سکتا ہوں۔

وہ ابھی تک نہیں ڈری تھی۔ پھر اُس نے مشکوک نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھ کر بڑے زور سے پھنکار ماری تھی۔

میری چتکبری جانتی ہے جانتی ہے کہ وہ تختے پر قدم رکھ کر ٹرک میں چلی جائے گی۔

لیکن وہ یہ نہیں جانتی کیوں کیوں وہ چڑھنا نہیں چاہتی ۔

ان سب نے مل کر اس کی پیٹھ پر لاٹھیاں برسائی تھیں ، گاے کی ٹانگیں تھر کی تھیں لیکن وہ اپنی جگہ سے قطعی نہیں ہلی تھی ۔ جب انھوں نے مل کر دوسرا وار کیا تو وہ تکلیف سے دور بھاگنے کو تھی کہ بابا کی داڑھی میں عقل نے جوش مارا تھا اور اس نے جاکر اس کے منہ پر لاٹھی ماری تھی ۔ گاے پھر تختے کی طرف منہ کرکے سیدھی ہوگئی تھی ۔ بابا نے ہانپتے ہوئے کہا تھا ۔

—آؤ بیٹو ۔

اور ان سب نے مل کر پھر لاٹھیوں کا مینہ برسایا تھا ۔

نکا دور کھڑا تھا ۔ بالکل بے تعلق بے حس ۔

—یوں بات نہیں بنے گی ۔

ایک نے اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا ۔

—تو پھر؟

وہ ٹرک کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ جانے گاے کو کیا سوجھی تھی ۔ پلٹ کر یکدم بھاگ اٹھی تھی ۔ اور دھول اڑاتی نکے کے قریب سے بالکل اجنبیوں کی طرح گزر گئی تھی ۔

نکا —— جسم کا مفلوج حصّہ ۔

—دیکھو ، دیکھو ، وہ تو بائیں طرف ۔

ایک چونکا تھا ۔

—قدرتی بات ہے ۔

بابا نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا ۔

گاے اپنے بچھڑے کو چاٹ رہی تھی ۔ بابا کی آنکھیں مکار سی مسکراہٹ سے چمک اٹھیں ۔

—اس بچھڑے کو یہاں لے آؤ —— یہ چال تو ہمیں کل ہی چل جانی چاہیے تھی ۔ ٹرک کے پیسے بھی بچ جاتے ۔

نکا —— مفلوج وجود

ان میں سے ایک نے بچھڑے کی رسی پکڑی تھی ۔ نکے کی زبان لرزی تھی ۔ گاے کچھ

سوچتی، قدم اُٹھاتی، رکتی چلتی بچھڑے کے پیچھے پیچھے اس کے قریب سے گزری تھی تو آہستہ سے نکّے کی زبان سے گالی پھسلی تھی۔ بچھڑا، تختے پر چڑھ کر پڑوسیاں مارتا ہوا ٹرک میں چلا گیا تھا۔ گائے تختے کے پاس جاکر پھر رکی تھی۔ بڑی حیرانی سے بچھڑے کو دیکھ کر آہستہ آہستہ گردن موڑ کے نکّے کو دیکھا تھا۔ ایک نے فوراً بغل سے پٹھوں کا گٹھا نکال کر گائے کے آگے کر دیا تھا۔ اس نے چند ڈنٹھل دانتوں میں لے لیے اور پھر کچھ سوچ کر زمین پر گرا دیے تھے۔ اور اگلا کھر تختے پر رکھ دیا تھا پھر دوسرا کھر۔

خدا معلوم نکّے کو کیا ہوا تھا۔ یک دم اس کے سارے جسم میں تازہ تازہ گرم گرم لہو کا سیلاب آگیا تھا۔ اس کے کان سرخ ہوگئے اور دماغ بے طرح بجنے لگا تھا۔ وہ بھاگا بھاگا گھر میں گیا تھا اور بابا کی دو نالی بندوق اتار کے اس میں کارتوس بھرے تھے۔ اس جنون میں بھاگتا ہوا باہر آگیا تھا اور کاندھے پر بندوق رکھ کر نشانہ باندھا تھا۔

اس نے کھلی آنکھ سے دیکھا۔ بچھڑا ٹرک سے باہر گائے کے گرائے ہوئے پٹھوں میں منہ مار رہا تھا۔ ٹرک میں بندھی گائے باہر منہ نکال کر بچھڑے کو دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے ایک گائے کو لے جانے کے لیے ٹرک میں بیٹھا تھا اور بابا ایک ہاتھ سے اپنی داڑھی میں عقل کو سہلاتا ہوا باہر کھڑے ڈرائیور سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

پھر مجھے پتا نہیں کیا ہوا۔ نکّے نے کسے نشانہ بنایا۔ گائے کو، بچھڑے کو، ڈرائیور کو، بابا کو، اپنے آپ کو، یا وہ ابھی تک نشانہ باندھے کھڑا ہے۔

کوئی وہاں جاکے دیکھے اور آکے مجھے بتائے کہ پھر کیا ہوا۔ مجھے تو صرف اتنا پتا ہے کہ ایک روز انھوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا۔

انور سجّاد

# کیکر

اس نے گدھے کی پیٹھ سے بالٹیاں اٹھا کر پوری قوت سے پانی بہایا

—— یہ بھی لو۔ یہ بھی لو۔

سفید دھول کا غبار اُٹھا اور پانی پر جم گیا۔ اس نے اپنے جسم پر آیا ہوا سارا پسینا دونوں ہاتھوں سے نچوڑ کر زمین پر ٹپکایا اور گدھے کو ہنکاتا انجیر کے درخت کے تلے آ گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

زمین کی زبان پر پھر کانٹے اُگ آئے ہیں سارا پانی بھاپ بن کر آسمان پر چلا گیا ہے ابھی بادل آئیں گے کب بادل آئیں گے کہ چاول بوؤں۔

گدھا زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔ جانے اسے کیا سوجھی کہ ہاتھ اور گھٹنے ٹیک کر وہ بھی زبان نکال کر ہانپنے لگا۔

—— میں تم ہوں اور تم میں ہوں

اس نے گدھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرگوشی کی۔ گدھے نے زبان منہ میں ڈال کر بڑی سنجیدگی سے منہ موڑ لیا۔ وہ جھینپ گیا۔ خفت کو مٹانے کے لیے ہنسنے لگا۔ دھیمی دھیمی ہنسی رفتہ رفتہ دیوانہ وار قہقہوں میں ڈھل گئی۔ وہ اُٹھا۔

—— ہا ہا۔

کوئی جواب نہیں

—— ہا ہا ہا ہا۔

مشرق مغرب شمال جنوب ہا ہا ہا ہا کوئی نہیں یہاں جو میری ہنسی سن کر اُنگلی

اُٹھائے وہ وہ گھر وہ گھروندا وہ گلی سائیں سائیں دُور دُور صرف کیکر کے درخت ہیں جو میری آواز سن کر جھومتے ہیں اور دھوپ زدہ آسمان پر اُنگلی اُٹھاتے ہیں ۔

شکریہ

اس کی آنکھیں کیکروں کی سبزی چوس کے پھر گدھے پر آ گئیں ۔ وہ اس سے اسی طرح منہ موڑے کھڑا تھا ۔ اسے گدھے پر غصّہ آ گیا ۔ اس نے اس کے پیٹ پر دو چار مکّے رسید کیے اور اس سے ردعمل کی اُمید میں اسے دیکھا ۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا ۔

گدھا ہا ہا ہا

گدھے نے منہ اُٹھا کر آنکھیں جھپکیں ۔ اس کو دھوپ میں کھڑا دیکھ کر یک لخت اُسے بڑا ترس آیا اور اسے رسی سے کھینچتا ، انجیر کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ۔

درخت کے نیچے بھی دھوپ اس کی چھاؤں کہاں گئی ہوں ں ں ں اس پر کتنے پتے باقی رہ گئے ہیں سورج کو انجیر کی خشک بانہیں کاٹ رہی تھیں ۔

ایک پتا نہیں کہاں ہے ایک دو تین چار ارے یہ درخت تو

اس کی آنکھوں میں تیز روشنی کے اندھیرے چھا گئے ۔

ہرا بھرا ہے ابھی تو کافی پتے ہیں اتنے کہ وہ درخت کے نیچے اندھیرا ہی اندھیرا ہے ۔

اس نے اپنی آنکھیں ، ملیں ، کھولیں ، ناچتے ہوئے تارے افق پر جا کے ٹوٹ بہے ۔ چمکتی لکیر چھوڑ گئے ۔

ہوتی دریا آ آ آ آ مکی جوار باجرہ میں چاول کیسے بوؤں کہ سونا کاٹوں دریا آ آ آ

اس نے آہ کو فوراً گلے میں دبا دیا ۔

میں آہ کو حلق سے نکلنے نہیں دوں گا کہیں وہ لوگ سن نہ لیں میں ہارا نہیں کیکر کے درخت سبز ہیں ان کی جڑیں دوُر دوُر زمین کی کوکھ تک اُتر گئی ہیں کہ یہ سرسبز ہیں میں بھی وہاں ہوں ایک دن ہماری جڑیں زمین کی چھاتیوں سے دودھ کھینچیں گی لیکن کب کب ان لوگوں کو یہاں سے بھاگے صدیاں بیت گئی ہیں اور میرا جسم شل ہو گیا ہے میں آہ نہیں بھروں گا کہیں وہ سن نہ لیں وہ بڈھا نہ سن لے جس نے کہا تھا کہ میں معتوب ہوں مجرم ہوں اور یہ میری سزا ہے کہ ساری عمر اس قید میں رہوں بس آہ نہیں بھروں گا کہ یہ راستہ میں نے خود پسند کیا ہے دریا سے یہاں تک یہاں سے دریا تک یہ اسیری میں نے خود چُنی ہے اور میں بہت خوش ہوں

یہ آہ نہیں نکلنی چاہیے

اس نے ہاتھ منہ پر رکھ کے چور آنکھوں سے سامنے دیکھا ۔ گرم ہوا گھروندوں کے کھلے دروازوں کو کھٹکھٹاتی تھی ۔ منڈیروں سے گرم خاک اڑاتی تھی ۔

اب وہ بڈھا کمبخت کیا سنے گا اب وہ تمام سیاہ بخت کیا سنیں گے جنھوں نے اس فضا پر اپنے کان بند کر دیے فرار ہو گئے سالے ویرانوں میں بھٹکتے ہوں گے ہریالی ہوگی کہ پرائے پیروں کو ڈستی ہوگی کہ وہ اپنی خاک کو روند کر آئے ہیں صرف میں ہوں کیکر کے درخت یا تم میں ہوں ۔

—— سنتے ہو ۔ میں نے تمھیں بتایا ہے کہ میں ہوں ۔

اس نے گدھے سے کہا ۔ گدھے نے آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر دانت نکالے ۔ ڈھینچوں کا ارادہ کیا ۔ پھر ملتوی کر کے ہوا میں منہ مارنے لگا ۔

—— کہ نہیں ہوں ؟

اس نے گدھے کی چپ سے خفا ہو کر پلٹ کر خالی گھروندوں کو دیکھا ۔ پوچھا ۔ سفید مٹی سے بگولے جنم لیتے تھے ۔ اُڑتے ہوئے آئے تھے اور ان گھروندوں کی دہلیزوں پر دم توڑ دیتے تھے ۔ یک لخت گدھے نے منہ اُٹھا کر ایک لمبی ڈھینچوں کی ۔

—— چپ کرو گدھے ۔ میں نے سوال کیا ہے

میں نے کس سے پوچھا ہے

اس کی نظریں گدھے کی چیخ پر سوار ہو کر آسمان پر پہنچ گئیں ۔ چلچلاتی دھوپ نیلاہٹوں میں سُلگتی تھی اور زمین پر سفیدی اُگلتی تھی ۔

میں ہوں کہ میری آنکھوں میں کائنات کا کوئی رنگ نہیں زمین آسمان ہے آسمان زمین رنگ کی غیر موجودگی سفیدی ہے سیاہی ہے اور سیاہی زمین پر سفید داغ ہے ۔

سفیدی ملی مٹی میں اُگی خار دار جھاڑیوں سے گرم ہوا اُلجھتی تھی اور بگولا بن کر آسمان کو اٹھتی تھی ۔

میں ہوں کہ زمین اور آسمان کے درمیان ستون ہوں نہیں ہوں کہ چلتا ہوا خالی گھروندوں کی دہلیزوں پر دم توڑتا ہوں کہ پھر جنم لیتا ہوں اور آسمان کو اُٹھتا ہوں کتنا خوب صورت چکر ہے سب بکواس ہے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں میری آنکھوں میں تو کیکر کے درختوں کی سبزی

ہے اور میں اس لیے ہوں کہ زمین کو چاٹتے سفید پھولوں کو دیکھتا ہوں اور ان سے جنگ کرتا ہوں میرے جسم پر زبانوں کے زخم ہیں

—— یار یہ کہیں ——

اس نے اچانک گدھے سے کچھ کہنا چاہا۔ گدھا اسی طرح منہ موڑے کھڑا تھا۔ اس نے گدھے سے مایوس ہوکر اپنے مکان کی طرف دیکھا۔ دائیں دیوار کے سامنے کچھ رقبے میں سبزیاں اُگی تھیں اور اس سرسبز رقبے کے وسط میں اس کے باپ اور ماں کی قبریں تھیں اس کے زندہ رہنے کی وجود۔

اماں کہیں تمھارے وجود کا عرق تو نہیں سفید سفید جو گہرائی سے سطح پر آیا ہے ماں یہ کہیں تیری چھاتیوں کا دودھ تو نہیں جو منوں مٹی تلے سے اُبل کے دھرتی کے سینے پر پھول بنا ہے۔

—— یہ دھرتی سوتیلی ماں ہے۔ ہمارے لیے اس کی چھاتیوں میں دودھ نہیں۔

سب نے زمین پر سفید سفید داغوں کا سیلاب آتے دیکھ کر کہا تھا۔

—— نہیں۔ نہیں۔

اس نے انھیں یقین دلایا تھا۔

—— اس کی چھاتیوں کو کوڑھ ہوگیا ہے۔

—— تمھاری ماں بھرماں ہے۔

—— ہم نے تمھارے کہنے پر اتنے دکھ سہے ہیں۔

—— اب ہم یہاں زندہ نہیں رہ سکتے۔

—— ہم اس پر تھوکتے ہیں۔

—— تم ماں کے جنے نہیں۔

وہ ان کے پیروں میں تھوک کر غصے میں کانپتا، اپنی کوٹھری میں آیا تھا اور کھڑکی سے تھوڑے سے رقبے میں کھڑی فصل میں اپنے ماں باپ کی قبروں کو دیکھنے لگا تھا۔

کیوں ماں کہیں یہ تیری چھاتیوں کا

اس کی نظریں قبروں سے پھسل کر سفیدی پر تیرتی افق پر جا پہنچیں۔

دریا —— آ ——

اسے دریا کے پانی سے نہلائیں۔ اس نے سوچا تھا۔ یہ کوڑھ ٹھیک ہوجائے گا۔ بارش

کا انتظار کرو ۔ رحمت کا انتظار کرو ۔

اس کی نظریں دریا کی لکیر سے اٹھیں ۔ آسمان قوس بنا کر حد نگاہ پر محیط ہو گیا ۔
آسمان یہ آسمان یہ آسمان الٹا لٹکا کنواں ہے جب کبھی کبھی ہنستا ہے تو اس کی تھوکوں کی چھینٹوں میں مکی مکی جوار باجرہ باجرہ چاول کیسے بوؤں کہ سونا اتاروں

ـــــ چاول کیسے بوئیں کہ سونا اتاریں ۔ ہم سب مقروض ہیں مجھے اتنا دینا ہے، اتنا دینا ہے ۔

ایک ایک کرکے سب نے کہا تھا : پانی کا ایک قطرہ نہیں اور چند روز میں زمین کی سفیدی ہمارا کفن ہو گی ۔

ـــــ سنو ـــــ سب میری بات سنو ۔

ـــــ ہاں بھئی ماں کے جنے کہو ۔

ـــــ دریا اونچائی سے اُترتا ہے ۔ چلو نالی لگا کر پانی یہاں لے آتے ہیں ۔

وہ سارے ہنسے تھے ۔

ـــــ نالی ! احمق یہ کوڑھ اندر سے آیا ہے ۔

پاگل ای اوئے پاگل ای اوئے ۔

ـــــ اس کے پانی میں شفا ہے ۔

پاگل ای اوئے ، پاگل ای اوئے ۔ ہنستے ہنستے ماں کی کوکھ کو ٹھوکر مار کے پہلے ایک گیا تھا ۔ پھر دوسرا ۔

ـــــ غدار ۔ بھگوڑو ـــــ تم ذرا سی بات پر قطع تعلق کرنے پہ تلے ہو ۔

اس نے گدھے کو ہل میں جوتا تھا اور پاگلوں کی طرح زمین پر لکیریں کھودنے لگا تھا ۔

ـــــ سنو ۔ میری بات سنو !

ـــــ ہاں بھئی ماں کے جنے ۔ اب کیا کہتے ہو ۔

ـــــ یوں کرتے ہیں کہ یہاں انجن لگا کر اس بس کو نکال پھینکیں ۔

ـــــ پاگل ای اوئے ۔ ہمارا بال بال گروی پڑا ہے ۔ ہم خود بک گئے ہیں ۔ اتنی رقم کہاں سے لائیں ۔

ـــــ ہنہ ، انجن لگائیں گے ماں کے یار ۔

ـــــ میں شہر جاتا ہوں ۔ مجھے یقین ہے ۔

وہ سارے ہنسے تھے ـــــ اگر ہماری آواز ان کانوں تک پہنچ سکتی تو ہم یہ داغ اُبھرنے ہی نہ دیتے۔

پاگل ای اوئے۔ ہنستے ہنستے ماں کی کوکھ پر ٹھوکر مار کے ایک اور گیا تھا۔ پھر ایک اور! باتیوں کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے تھے۔ اس نے ساتھ والے گھر میں پناہ ڈھونڈنا چاہی تھی۔ وہاں بھی لشکتا ہوا لونگ ماند پڑ گیا تھا اور لونگ والی سر جھکا کے باہر صحن میں بکری کے بچے کو سینے سے لگا کر پھسک پھسک کر رونے لگی تھی۔

ـــــ اب ہم بھی چلے جائیں گے ـــــ اس نے بکری کے بچے کی پیٹھ سے سر اُٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ ہمارے مویشی مر رہے ہیں۔ ہمیں بچے پالنا ہیں۔ بیٹیوں کا بیاہ کرنا ہے اس زمین پر بانجھ بادلوں کا سایہ ہے۔ اور اس زمین کا سایہ ہماری چھاتیوں پر۔ ایڑیاں مارتے مارتے ہماری ایڑیاں چھل گئی ہیں۔ چشمے کہاں ہیں؟

چشمے کہاں ہیں کہ سفیدی سبز ہو سبزی سُرخ ہو کنواریوں کے گالوں میں لالی اترے لونگ والی اپنے لونگ پر گھونگٹ کاڑھے جو کہ اس کی ماں کی ماں پھر اس کی ماں کی ماں نے جو کہ پہلی ناک سے اس کی ناک تک پہنچا ہے۔

ـــــ شہر سے کب آئیں گے وہ لوگ۔

اس کے شہر سے لوٹنے پر لڑکی ہر روز اس سے پوچھتی تھی۔

ـــــ کب آئیں گے وہ؟

ـــــ پھر وہ آخری مرتبہ اس سے پوچھنے آئی تھی۔ اس کے بابا نے کہا تھا کہ آئندہ اگر وہ اس خودسر اور بے ادب سے ملے گی تو وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے وہیں پھینک جائے گا۔

ـــــ دو ایک دن میں۔

بڈھے نے کہا تھا اس نے ان سب کو فریب میں رکھا ہے۔ سبز باغ دکھائے ہیں۔ دن کو سپنے دیکھنے والا مجرم ہے، گردن زدنی کے قابل۔

ـــــ تمھیں یقین ہے کہ وہ تمھاری بات مان لیں گے۔

مجرم سے راہ و رسم رکھنے والا بھی مجرم ہے اگر تم اس سے پھر ملیں تو تمھاری لاش اس سفید آگ میں جلتی رہے گی۔

ـــــ ہاں مجھے یقین ہے۔

اور کوئی گدھ بھی نہیں ہوگا جو تمھیں اس اذیت سے نجات دلائے۔

___اگر تمھیں یقین ہے تو پھر مجھے بھی یقین ہے۔

لڑکی نے اطمینان کا سانس لیا تھا اور دبے پاؤں چلتی اپنے گھر کی کھڑکی میں غائب ہوگئی تھی۔

اس نے کھڑکی سے نظریں چھڑا کر کنکھیوں سے گدھے کو دیکھا۔ گدھے نے دانت نکال دیے۔ وہ اس کی استہزائیہ مسکراہٹ دیکھ کر شرمندہ سا ہوگیا۔

نہیں میں اس کے بارے میں تو نہیں سوچ رہا تھا بخدا میں اپنے وعدے پر قائم ہوں میں نے اتنا عرصہ کبھی اس کے بارے میں سوچا ہے اچھا نہیں تو نہ مانو

اس کی نگاہیں پھر سامنے اُٹھ گئیں۔ بگولے دہلیز کو پار کر کے کال کوٹھریوں میں جاتے تھے اور اندھیروں سے گلے ملتے تھے۔

ایک دن وہ آئے تھے اور اس نے سوچا تھا کہ اب میری گردن بگولوں اور اندھیروں کی گرفت سے آزاد ہوگی بچے کھچے باسیوں نے دیکھا تھا۔ دونوں بابو انگریزی میں باتیں کرتے ہنستے ہنستے اس کے گھر سے نکلے تھے اور پیٹ میں سوکھے شلغموں کی گڑگڑ کو دبا کر اس کے گدھے پر سوار ہوگئے تھے۔ علاقے کے دورے سے لوٹ کر انھوں نے اپنی خالی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر منہ ٹیڑھا کر کے کہا تھا۔

___سوری۔ یہاں پیسہ اور وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

انھیں جاتا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آگ بھر گئی تھی۔ اس کا جسم سنسنا اُٹھا تھا۔ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ ان بابوؤں کو سفید زمین میں گاڑ کر سہاگ پھیر دے۔ لیکن انھیں وہ صرف دیکھتا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے کانوں میں دھک دھک کی جگہ قہقہے اُبھرنے لگے تھے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تھا، لوگ چیخ چیخ کر ہنس رہے تھے۔

پاگل ای اوئے۔ پاگل ای اوئے۔

قہقہے بڑھتے بڑھتے پھیل گئے۔ کھڑکی کھٹاک سے بند ہوئی۔ دُور بیابانوں سے بگولوں کا قافلہ آرہا تھا لوگوں کی ہنسی اور تیز اور تیز۔

پاگل ای اوئے، پاگل ای اوئے۔ انھوں نے بچے کھچے مویشیوں پر سامان لادا تھا۔ ہنستے ہنستے سب نے کوکھ پر لات ماری تھی اور قدم بڑھا دیے تھے۔

انجیر کے تنے سے ٹیک لگا کر بوڑھا کھڑا وہ خاموشی سے اپنے ہاتھ میں انجیر کے پتّے

کو سہلاتا رہا تھا۔ سب سے آخر میں وہ اپنے بابا کے ساتھ نکلی تھی۔ اس نے ہوا کا گھونگٹ بھرا تھا۔ دونوں باپ بیٹی نے کچھ عرصہ ایک دوسرے سے کھسر پھسر کی تھی اور اس کے پاس آئے تھے۔

—— اپنی ہٹ دھرمی چھوڑو اور چلو۔

لونگ والی اسے دیکھے جا رہی تھی۔

وہ چپ تھا۔

—— میرے تمھارے باپ کے ساتھ بہت گہرے تعلقات تھے۔

میرے اپنی ماں کے ساتھ زیادہ گہرے تعلقات ہیں۔

—— یہ تھوڑا سا رقبہ تمھارا کب تک ساتھ دے گا۔

اس نے کیاریوں کی طرف دیکھا تھا۔

جب تک میں ہوں

چلو ہم دریا کے پار چلیں۔

دریا کے پار پھول کا رستہ ہے جو گئے کھو گئے۔

—— میں نے تمھارے باپ کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ اپنی بیٹی کی شادی تمھارے ساتھ کروں گا۔

لڑکی نے پلکیں نہیں جھپکی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں اژدھے کی آنکھیں تھیں۔

اس کے ہاتھوں میں انجیر کا پتّا بُری طرح مسلا گیا تھا۔

—— چلو۔

میرا دوسرا قدم خلا میں پڑے گا

—— بولو تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟

—— میں نہیں جاؤں گا۔

اس نے اپنے آپ کو اژدھے کی آنکھوں سے چھڑا لیا تھا۔ لڑکی کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

بڈھے نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

—— تم اس ویرانے میں زندہ نہیں رہ سکوگے۔ وہ دیکھتے ہو سامنے۔

ٹنڈ منڈ درختوں پر گدھ سر نیوڑھائے بیٹھے تھے۔

—— میں نے اپنے لیے یہ فیصلہ خود کیا ہے۔ کیونکہ مجھ میں زندہ رہنے کی خواہش ہے۔ تم لوگوں

میں سکتے نہیں، اس لیے بھاگ رہے ہو وہ دیکھتے ہو سامنے کیکر کے درخت کیسے ہرے بھرے ہیں جو ہر روز ایک سوت بڑھتے ہیں۔

بڈھے نے احمقوں کی طرح کیکروں کو دیکھا تھا۔

—ان کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ اتھاہ سے رس پیتی ہیں۔ تم نے فرار کا راستہ خود چنا ہے۔ تم اس جگہ کو ترک کر کے کہیں جگہ نہیں پاؤ گے۔ بھٹکتے رہو گے کہ تمھاری یہی سزا ہے۔

—بکواس بند کرو۔

بڈھا چیخا تھا اور ٹنڈ منڈ درختوں پر گدھوں نے سر اٹھا کے دیکھا تھا۔

—ہم تمہیں ترک کرتے ہیں کہ تمھارے نصیبوں میں یہی لکھا ہے۔

—جو بھی کہو - یہ میری اپنی خواہش ہے۔

—تمھاری وابستگی کی یہی سزا ہے۔

اس نے اپنی لڑکی کا کندھا تھپتھپایا تھا۔

—یہ سیاہ بخت ہے۔

لڑکی نے اپنی بجھتی لونگ پر سفید چادر کا پلّو گرایا تھا اور چلی گئی تھی اور رینگتی لکیر کی آخری کڑی بن گئی تھی۔

ٹنڈ منڈ درختوں پر سارے گدھوں نے اپنے پر پھڑپھڑائے تھے اور لکیر کے ساتھ ساتھ ہو لیے تھے۔

—میں سیاہ بخت ہوں۔

رینگتی لکیر کو فاصلہ نگل گیا تھا۔ وہ مسکرایا تھا۔ اس نے کیکر کے پتوں کی ساری سبزی آنکھوں میں سمیٹی تھی اور زمین پر لوٹنے لگا تھا۔ جب اس کے ایک ایک مسام میں سفیدی سی رچ گئی تھی تو اس نے عزم کے ساتھ گدھے پر بالٹیاں لادی تھیں اور اس کی تھوتھنی کو چوما تھا۔

ہم سیاہ بخت ہیں میری جان کہ ہم نے یہ راستہ خود چنا ہے

اور اسے بڑی محبت سے ہانکتا دریا کو روانہ ہوا تھا۔

اس نے کھڑکی میں اندھیرے اور جگنوؤں سے آنکھیں چھڑا کر زمین کو دیکھا۔

ہوں پھر زبان خشک ہے

اس نے اٹھتے ہوئے گدھے کو ہانکا۔

آؤ پھر دریا کو چلیں کہ پانی بھاپ بن کے آسمان پر چلا گیا ہے آؤ کہ ہم اس دائمی عمل کا حصّہ ہیں یہی ہمارا انعام ہے یہی ہماری سزا ہے کہ یہ ہمارا اپنا فیصلہ ہے کہ ہم زندہ رہیں گے ہماری کش مکش ہماری خواہشوں کا تسلسل ہے۔

اس نے گدھے پر بالٹیاں لادیں اور مضبوط قدم اٹھاتا ہوا دریا کو چل دیا۔

○

انور سجاد

# سنڈریلا

کبھی وہ سوچتی : اس کی عمر ایک لمحہ ہے، کبھی وہ سوچتی : اس کی عمر سو سال ہے، کبھی وہ سوچتی : وہ عمر کی قید میں نہیں، یا شاید ابھی اسے جنم لینا ہے۔

وہ اس کمرے میں سدا سے قید تھی اور اس امید میں تھی کہ کوئی آئے اور اسے اس بلن سے چھڑائے۔ پھر وہ سوچتی : کوئی کب اسے چھڑائے گا، اسے خود ہی کوئی حیلہ کرنا ہوگا، اس بلن سے مر کے نکلے تو کیا نکلے! وہ چپکے سے دروازہ کھول کر باہر دیکھتی۔ باہر دروازے کے سامنے وہ بھاری بھرکم خونی کتا زبان نکالے ہانپتا ہوا وحشی مکار نظروں سے دیکھتا؛ جو ازل سے وہاں کھڑا تھا۔ وہ کتے کو پچکارنے کی کوشش کرتی، کتا خونخواری سے بھونکتا، قدم اٹھاتا، وہ پچھلے پیر پلٹ کر جھٹ دروازہ بند کر دیتی۔ کتے کے بھونکنے سے ماں کو پتا چل جاتا کہ اس نے پھر کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ مع اپنی بیٹیوں کے آتی، کتے کو تھپکی دیتی اور کمرے میں داخل ہو کر بغیر کچھ کہے سنے اس کی خوب پٹائی کرتی۔ جاتے ہوئے اس کی بہنیں کئی گز الجھی ہوئی اون اس کے سامنے ڈال دیتیں اور ماں غراتی کہ جب تک اون کی گنجلکیں نہیں کھلتیں اسے کھانا نہیں ملے گا۔ اس کی آنکھوں کے تمام آنسو خشک ہو جاتے وہ اون سلجھانے لگتی اور کھڑکی سے باہر کھلے آسمان کی طرف دیکھنے لگتی۔

اس کی ماں سوتیلی تھی اور بہنیں بھی سوتیلی۔

اس کی ماں اس کے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی اور اس کا باپ اس پیدائش سے ایک سال بعد۔ اس نے اپنے سگے ماں باپ کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس کا تصور

بہت محدود تھا۔ اس کی کائنات یہی کمرہ تھی جس میں اس نے آنکھ کھولی تھی۔ بچپن میں جو عورت مسکرا کے دیکھتی تھی، اس کی ماں تھی، جو شخص اس کے سر پر ہاتھ رکھتا تھا، اس کا باپ تھا۔ پھر یہ سب مسکراہٹیں اور پُرشفقت ہاتھ سمٹ سمٹا کر سوتیلی ماں، بہنوں اور خونخوار کتے کے وجود میں غائب ہو گئے تھے۔

اس نے ایک دو مرتبہ کمرے کی کھڑکی سے بھی بھاگنے کی کوشش تھی، پر جانے اس بیری کتے کو کیسے خبر ہو جاتی، کہ جونہی وہ کھڑکی کی دہلیز پر پیر رکھتی وہ کتا باہر کھڑکی کے نیچے، زبان نکالے وار ننگ کی نظروں سے دیکھتا کھڑا ہانپ رہا ہوتا۔ وہ بے بس ہو کر پھر کمرے میں اتر آتی اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگتی۔ کبھی کبھی کھڑکی سے ایک کنکر آکے پیروں میں گرتا۔ وہ اپنے میلے دوپٹے کے پلّو سے آنکھیں پونچھتی، سینے میں اُٹھتے طوفان کا گلا گھونٹتی، وہ کنکر اُٹھاتی، کونے میں پڑے اسی قسم کے بہت سے کنکروں میں رکھ دیتی اور سوچتی:

نہیں، میں کھڑکی میں نہیں جاؤں گی۔

نہ چاہنے کے باوجود وہ دیوار کی اوٹ میں ہو کر کھڑکی سے، سڑک کے پار، سبز درخت کے نیچے کھڑے اس دیوانے کو دیکھتی جو سُرخ چادر اوڑھے ٹکٹکی لگائے اس کھڑکی کی طرف دیکھتا مسکراتا رہتا تھا۔

یہ سرخ چادر والا دیوانہ بھی عجیب شخص تھا: گنجا سر، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، چھدری داڑھی، ناٹا قد۔ سبز درخت کے نیچے گولڈ مہر کا بہت بڑا پھول لگتا تھا۔ اس علاقے کے لمبے تڑنگے لڑکے زلفیں بکھرائے، کمر سے گرتی پتلونیں پہنے، کوکا کولا پیتے ہوئے اُسے چھیڑتے، آوازے کستے، پتھر مارتے لیکن یہ دیوانہ بس مسکراتا رہتا تھا۔ لڑکے خود ہی ہار کر چلے جاتے۔ لیکن کبھی وہ بہت تنگ آجاتا تو زخمی شیر اس زور سے نعرہ لگاتا کہ زمین و آسمان دہل جاتے اور شرارتی لڑکے اپنی کوکا کولا وہیں چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ پھر وہ دیوانہ فلک شگاف آواز میں گیت گاتا۔ وہاں کے ننگ دھڑنگ پھولے پیٹ والے بچوں کو جمع کرتا اور کمر سے بندھے تھیلے سے ریوڑیاں اور مٹھائیاں نکال کے بانٹنے لگتا۔

وہ اپنے ہونٹوں کی پپڑیوں پر خشک زبان پھیرتی سوچنے لگتی:

یہ خود پتھروں کا شکار ہے، میری مدد کیسے کر سکتا ہے!

یہ دیوانہ بھی سدا سے وہیں تھا اور اس کی زندگی کی حقیقتوں کا حصہ تھا۔ اسے اس کے علاوہ اور کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ دیوانہ ہے، لڑکوں سے پتھر کھا کے بچوں میں ریوڑیاں تقسیم کرتا ہے، اس کی آواز بے حد سریلی ہے، دہاڑ سو شیروں جیتنی۔ اور جب اس کے چاروں طرف تاریکیاں چھا جاتی ہیں تو ایک ٹمٹماتا ہوا کنکر اس کے پیروں میں آ گرتا ہے وہ اپنے سینے میں اُٹھتے طوفان کا گلا گھونٹ دیتی ہے:

نہیں نہیں، میں کھڑکی میں نہیں جاؤں گی، وہ مجھے اپنے پاس بلائے گا۔ میں کھڑکی سے نیچے پیر رکھوں گی تو خونخوار کتا میری تکا بوٹی کردے گا۔ لیکن یہ خود کھڑکی پھلانگ کر یہاں کیوں نہیں آجاتا؟ اسے کیا پتا میں کس حال میں ہوں۔ نہیں، اسے مجھ میں اتنی دلچسپی نہیں یا وہ یہ چاہتا ہے کہ میں خود ہمت کروں۔ لیکن اگر کسی طریقے سے میں اس تک پہنچ بھی جاؤں تو کیا فرق پڑے گا؟ دیوانہ ہے، فقیر ہے، مجھے میری ماں بہنوں ایسے کپڑے کہاں سے لاکر دے گا؟ مجھے ریوڑیاں اچھی نہیں لگتیں۔ مگر یہ ہے کون اور سدا ٹکٹکی لگائے کھڑکی کی طرف کیوں دیکھتا رہتا ہے۔ وہ چاہتی بھی تو کچھ نہیں جان سکتی تھی، وہ چاہتی بھی تو اسے کچھ بتا نہیں سکتی تھی کیونکہ اس کی ماں سوتیلی تھی، بہنیں سوتیلی تھیں اور وہاں سے نکلنے کے راستے پر خوفناک کتے کا پہرہ تھا۔ اس کتے سے اس کی جان جاتی تھی۔ جب کبھی وہ چوری چھپے کچھ کھانے لگتی تو وہ کہیں سے آن موجود ہوتا، جب وہ اپنی بہنوں کے کپڑے چرا کر پہننے کی خواہش کرتی تو اس کتے کا تنفس اس کی ہر خواہش پر چھا جاتا، ہر قسم کی قید سے فرار کے ہر راستے پر وہ زبان نکالے ہانپتا ہوا وحشی، مکار نظروں سے دیکھتا کھڑا ہوتا۔

اس کی ماں اور بہنیں ہر وقت زرق برق پوشاک پہنے رہتی تھیں۔ اکثر ان کے گھر مہمان آتے رہتے تھے۔ ہر رات وہ خود کہیں نہ کہیں دعوت پر چلی جاتیں۔ اسے کسی سے نہ ملنے دیا جاتا تھا۔ مہمانوں کے آنے سے پہلے اسے سارے گھر کو شیشے کی طرح چمکانا پڑتا۔ اس کی ماں اور بہنیں بننے سنوارنے میں مصروف ہوتیں۔ جب گھر میں مہمانوں کے قہقہے گونجنے لگتے تو وہ باورچی خانے میں بند ہوکر برتن دھونے لگتی۔ رات کو جب وہ چلی جاتیں تو یہ تھکی ٹوٹی اپنے کمرے میں آجاتی اور نہ چاہنے کے باوجود کبھی کبھی کنکر کا انتظار کرنے لگتی۔

ازل سے اس کی یہی زندگی تھی۔

پھر ایک رات اس کی ماں اور بہنیں حسب معمول کسی دعوت پر گئی تھیں اور وہ اپنے

کمرے میں بیٹھی دل بہلانے کے لیے ان کنکروں کو گن رہی تھی تو اس کا نیم روشن کمرہ یکایک جگمگا اٹھا ۔ اس نے چونک کر کھڑکی کی طرف دیکھا ؛ بہت تیز روشنی تھی ۔ باہر کار کے انجن کی آواز آرہی تھی ۔ نہیں وہ نہیں ہو سکتا ۔ وہ گھٹنوں بجتے لڑکھڑاتے دل کو سنبھالتی کھڑکی کے پاس گئی ۔ اوٹ سے دیکھا ؛ ایک شاندار لمبی سیاہ کار کھڑی تھی ۔ ایک خوبرو نوجوان سیاہ سوٹ پہنے اُترا اور بوٹائی کو درست کرتا اس کی کھڑکی کے قریب آگیا ۔

—— تم ہو ؟

اس نے سرگوشی میں کہا ۔

—— تم آگئے ، تم آگئے ۔ مجھے ازل سے تمھارا انتظار تھا ۔

اس نے دیوار کے ساتھ سر لگا کے آنکھیں موند لیں ۔ پھر یک دم گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا ؛ کتا کہیں نہیں تھا ۔

—— تم ہو ؟

—— ہاں ۔

لفظ اس کی زبان سے پھسل گیا ۔

—— گڈ ۔

وہ کھڑکی پھلانگ کے اندر آگیا ۔

—— نہیں نہیں ، تم چلے جاؤ یہاں سے ۔ میری ماں سوتیلی ہے ۔

—— گھبراؤ نہیں ۔ کوئی بات نہیں ۔ وہ یہاں نہیں آئے گی ۔ لو یہ پہن کر دکھاؤ ۔

نوجوان نے اپنی جیب سے بڑا خوب صورت جوتا نکالا جس میں ہیرے جڑے تھے ۔

—— پہنو ۔

نوجوان کی آواز میں تحکم تھا ۔ وہ مفلوج سی ہوگئی اس نے آواز کے سحر کے زیر اثر جوتا پہن لیا ۔

—— بالکل فٹ ہے ، تمھارا ہی ہے ۔

—— میرا ؟

—— ہاں تمھارا ۔ تم رات شہزادے کی دعوت سے بھاگتے وقت چھوڑ آئی تھیں ۔

—— میں ؟

___ ہاں ۔ تمھیں یاد نہیں ایک پری تمھیں ہمارے شہزادے کے محل میں لے گئی تھی اور تم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ ___

___ لیکن وہ تو خواب تھا ۔

___ وہ خواب تھا یا نہیں تھا، مجھے تاویلیں پیش کرنے کا حکم نہیں ۔ چلو شہزادہ تمھارے انتظار میں بے قرار ہے ___ چلو ۔

اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا ۔ آخر ہزار سال بعد وہ دن آ ہی گیا کہ اس کی نجات ہوگئی اور وہ بھی اتنے شاندار طریقے سے شہزادے کے ہاتھوں ۔ اس کی ماں اور بہنوں کو پتا چلا تو وہ حسد کی آگ میں جل جل کر مر جائیں گی ۔ پھر بھی اس نے انجانے خوف سے کہا:

___ لیکن ___

___ لیکن ویکن کچھ نہیں ۔ شہزادہ تمھیں اس قید سے نجات دلا کر رہے گا ۔ پھر تم ساری عمر اس شاندار محل میں رہو گی جہاں ___

اس نوجوان نے اس کے سامنے جنت تخلیق کی ۔

___ اب چلو ۔

اس نے اپنے میلے کپڑوں پر نظر ڈالی اور نوجوان بھانپ گیا ۔

___ اس کی فکر نہ کرو ۔ کار میں شہزادے کا بھیجا ہوا لباس رکھا ہے ۔

___ مگر وہ کتا ___

اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا ۔

نوجوان نے ہنس کر کھڑکی سے باہر چھلانگ لگائی اور اپنے پیروں کی طرف اشارہ کیا ۔ خونخوار کتا معصوم بکری بنا ڈاک فورڈ کی ضیافت اڑانے میں مصروف تھا ۔

___ آؤ ۔

نوجوان نے حکم دیا ۔

وہ جنت کی خواہش میں کھڑکی سے اتر آئی ۔ نوجوان نے اس کے لیے لیموسین کا دروازہ کھولا ۔ وہ کار میں قدم رکھنے ہی والی تھی کہ اس کے کانوں میں آواز آئی :

___ نہ جانا ۔

اس نے چونک کر دیکھا ، پاس ہی سبز درخت کی اوٹ میں سرخ چادر والا دیوانہ کھڑا تھا۔ اس نے گھبرا کر دیوانے کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا ۔ دیوانہ مسکرایا :

—— یہ کچھ نہیں سن سکتا اسے کچھ خبر نہیں ۔

اس نے نوجوان کو دیکھا : نوجوان دروازہ کھولے ساکت کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں جامد تھیں ۔

اس نے پھر فٹ بورڈ کی طرف قدم بڑھایا ۔

—— نہ جانا ۔

دیوانے نے پھر کہا ۔

—— میں شہزادے کی جنت میں جا رہی ہوں ۔

—— پھر واپس نہ آپاؤ گی ۔

—— تمھیں اس سے کیا ؟ وہ بہت خوب صورت ہے ، شہزادہ ہے ۔

—— تو پھر میری ایک بات مانو : جب وقت ٹھہر جاتا ہے اور مرتا ہوا لمحہ دوسرے لمحے میں جنم لیتا ہے ، اس لمحے سے پہلے پہلے لوٹ آنا ۔

وہ ہنسی

—— میں تمھارا انتظار کرونگا ۔

وہ اور زور سے ہنسی اور کار میں آکر بیٹھ گئی ۔

—— دیوانہ

—— کون دیوانہ ؟

نوجوان نے پوچھا ۔

—— تم نہیں جانتے ۔

اس نے کار کے پچھلے شیشے سے دیکھا ۔ اس کے کمرے سے آتی مدھم روشنی میں دیوانہ سبز درخت میں گولڈ مہر کا پھول تھا ۔

محل میں لوگوں کا ہجوم تھا ۔ ہر رنگ ، ہر نسل کے لوگ تھے ۔ گورے چٹے نیلی آنکھوں والے شہزادے نے بڑے فخر سے استقبال کیا ۔ مہانوں سے تعارف کرایا ۔ اس کے پیر زمین پر نہیں تھے ، وہ جنت میں تھی ۔ رفتہ رفتہ اس کے کانوں سے آواز غائب ہوگئی تھی ۔

اس لمحے سے پہلے پہلے لوٹ آنا جب مرتا ہوا لمحہ دوسرے لمحے میں جنم لیتا ہے۔ وہ بار بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتی تھی۔ شہزادے نے تنگ آکر اس کی گھڑی اُتار کے پھینک دی۔ ساتھ ہی وہ آواز بھی مرگئی۔

شکریہ

اس نے کہا اور کھِل کھِلا کے ہنس پڑی۔

اس نے سونے کے برتنوں میں کھانا کھایا اور ہیرے جڑے گلاسوں میں پانی پیا۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ پیٹ بھر کھانا کھایا۔ اسے کھانے کا نشہ اتنا چڑھا کہ ناچ کے لیے شہزادے کی درخواست پر وہ بمشکل اٹھی۔

ہر راونڈ میں شہزادہ اسے سینے کے ساتھ چمٹا لیتا اور وہ بادلوں میں اُڑنے لگتی۔ باقی سب شہزادیاں دل ہی دل میں کڑھتی تھیں اور اسے کوستی تھیں۔

ایک راؤنڈ میں شہزادہ اسے سینے سے چمٹائے موسیقی کی لہروں پر بہتا اسے اپنی خواب گاہ میں لے آیا اور وہ دونوں نڈھال ہوکے پروں کے بستر پر گر پڑے۔ شہزادے نے ہاتھ لہرا کر سونے سے بھری طشتریوں کی طرف اشارہ کیا۔

—— یہ سب تمھاری ہیں۔

—— ہوں

اس نے نیم خوابیدہ آنکھوں سے دیکھا۔

—— اب تمھیں کسی چیز کی ضرورت نہیں رہے گی۔

—— ہوں۔

—— اب تم میری ہو۔

جانے شہزادے کو کیا ہوا اس نے اس کا گریبان پکڑ کے جھٹکا دیا۔ اس نے چونک کر دیکھا: شہزادے کے چمکیلے دانت ایک ایک کرکے گرنے لگے۔ وہ گھبرا کے اٹھی۔ شہزادے کا بھیجا ہوا لباس روئی کا تھا۔ شہزادہ دیوانہ وار روئی نوچ رہا تھا۔ وہ اس کے بازووں میں کسمسائی۔ عین اسی وقت خواب گاہ کا کلاک چیخا: وقت رک گیا ہے۔ رک گیا ہے۔ لوٹ آؤ۔ لوٹ آؤ۔ بھاگو۔ بھاگو۔ دوسرے لمحے کے پہلے سانس سے پہلے لوٹ آؤ۔

اس نے اپنے آپ کو چیختے ہوئے شہزادے کو دیکھا:

شہزادے کی مصنوعی بالوں کی وگ سر سے اُتر گئی تھی، اس کی نیلی آنکھیں کرچی کرچی ہوگئی تھیں، اس کے دانت جھڑ چکے تھے۔ صرف کینائینز (CANINES) تھے جن پر خون کی سرخی تھی۔
وہ اس کے پنجوں سے تڑپ کر نکلی۔
— یہاں سے کیسے جاؤ گی
شہزادہ ہنستے ہنستے بستر پر دھرا ہوگیا۔ کلاک اور بھی زور سے چیخا۔ وہ اپنے ستر کو ہاتھوں سے ڈھانپ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ وہاں اس کی سوتیلی ماں اور بہنیں ہیرے کی جوتیاں پہنے، اس کی طرف بازو پھیلائے کھڑی ہنس رہی تھیں۔ وہ دوسرے دروازے کی طرف بھاگی۔
دوسرا، تیسرا، چوتھا۔ ہر دروازے پر اس کی سوتیلی ماں اور بہنیں بازو بڑھائے اسے پکڑنے کے لیے کھڑی ہیں۔ وہ پاگلوں کی طرح اس جنت میں چکر لگا رہی ہے۔ شہزادے کے قہقہے کلاک کی چیخوں میں اُلجھے اس کا پیچھا کر رہے ہیں اور وہ ہاتھوں سے اپنا ستر چھپائے بھاگ رہی ہے، بھاگ رہی ہے۔

⊙

# پرندے کی کہانی

انور سجاد

— یو بلڈی باسٹرڈ۔

دربان نے زمین پر زہر تھوکا، آستین سے منہ پونچھا اور نوٹ والی مٹھی جیب میں ڈال لی۔ اُس کی نظریں باہر دالان کی طرف کھلتے دروازے پر تھیں۔ جاتے جاتے سفید فام سیاح، پیا، س ف س نے گھوم کر ہاتھ ہلا کے الوداع کہا۔ دربان کی زبان سے پھر زہر ٹپکا، اُس نے آستین سے دوبارہ منہ صاف کیا، چور آنکھوں سے لوگوں کو دیکھا، مسکرا کے جواب میں ہاتھ ہلایا اور جیب میں نوٹ کو ملتا مقبرے کی محراب کے نیچے اپنی جگہ پر آ کے بیٹھ گیا۔ وہ مسرور تھا اور نہیں بھی۔

س ف س بہت مسرور تھا۔ نیلے کانچ میں اس زمین کا سارا اسرار محصور تھا۔ اُس نے مڑ کے محراب کی تصویر لی، جوتوں پر چڑھے خول اتارے اور صحن میں آ گیا۔ کچے فرش سے سوندھی سوندھی باس اُٹھ رہی تھی۔ اس نے گہرا سانس لے کر باس کو سینے میں بھرا۔ دوسرے ہی لمحے سانس کے ساتھ ہی یہ باس پھر ہواؤں میں بکھر گئی۔

میں اس خوشبو کو کیمرے میں قید نہیں کر سکتا۔

س ف س نے مایوسی میں سر کو ہلایا اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس کے جوتوں کے نیچے صحن میں بکھرے دانے چرچرا رہے تھے۔ آس پاس ہی دانہ چگتے پرندوں کے غول میں کوئی غیر فطری بات نظر نہ آئی۔ حسبِ معمول پرندوں کی دنیا وہ دانہ تھی جو چونچ کے نیچے تھا؟ اس دانے کے علاوہ ہر شے معدوم۔ یہ دانے کس نے پھینکے تھے؟ پرندوں کو معلوم تھا کہ یہ دانے کہاں سے آئے ہیں؟ انھیں یہ یقین تھا کہ ان دانوں کی تہ میں کوئی جال نہیں؟

یہ معمولی اور غیراہم سوال تھے۔ مجھے کیا؟ یہ پرندوں کے ذاتی مسائل ہیں۔ ظاہر ہے کسی سخی ہاتھ ہی نے یہ دانے بکھیرے ہوں گے۔

س ف س نے سر کی ایک جنبش کے ساتھ ہی سارے سوال جھٹک دیے۔ وہ تھم تھم کے قدم اُٹھاتا پرندوں کے قریب سے گزر کے باہر کے دروازے سے نکلنے والا تھا کہ پرندوں کے غول میں ایک پتھر آکے گرا۔ پرندوں نے لمحہ بھر کے لیے پر تولے اور پھر دانہ چگنے لگے۔ لیکن اب ان میں پہلا سا اطمینان نہیں تھا۔ وہ بار بار گردنیں اٹھاکے اس اور دیکھتے تھے۔ جس سمت سے پتھر آیا تھا۔ س ف س نے اس طرف دیکھا۔ منڈیر پر ایک لڑکا بیٹھا تھا: بہت معصوم اس کی مسیں ابھی نہیں بھوٹی تھیں۔ س ف س کے ذہن میں جانے کیوں حضرت عیسیٰ کے بچپن کے کئی نقش گزر گئے، لیکن وہ سب کے سب چہرے اوپرے اوپرے اجنبی سے تھے۔ وہ معصوم چہرہ وہاں کی زمین تھا: سوندھی سوندھی باس، گندمی گندمی مٹی، نصف کرۂ ارض پر محیط۔

اگر میں مصور ہوتا تو اسے فوراً اپنے سٹوڈیو میں لے جاتا۔

اس نے اپنے کیمرے کو تھاما۔

نہیں، یہ مشین کا کام نہیں۔ دماغ میں اس لڑکے کے بھڑکائے ہوئے شعلے سلولائیڈ کو راکھ کر دیں گے۔

لڑکے نے اپنی قمیص کے دامن سے بہتی ہوئی ناک کو پونچھا اور غول کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے دوسرے پتھر کو اُچھالنے لگا۔ اس سے پیشتر کہ وہ غول میں دوسرا پتھر پھینکتا س ف س یک دم چلایا:

—— او —— یو —— جیوڈاس۔

لڑکا اس کے تیور دیکھ کر منڈیر سے اُتر کر بھاگ گیا۔ س ف س نے خشک گلے کو تھوک سے تر کر کے اطمینان کا سانس لیا۔

میں خواہ مخواہ زمین کے رنگ اور خوشبو کے جھانسے میں آکر جذباتی ہوگیا تھا۔ جیوڈاس ہی تو تھا۔ بالکل جیوڈاس۔

اُس نے غول کی طرف دیکھا۔ پرندوں میں اب بھی کسی حد تک اضطراب تھا۔ اس لے جانے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ نیلے کانچ میں محصور سارا اسرار تتلیوں میں پھیل گیا۔

غول سے ایک عجیب وغریب پرندہ نما چیز نکل کر زمین کو سونگھتی آگے بڑھی۔ اس کی کھال پروں سے مبرا تھی۔ صرف روئیں تھے جو کہ پر نچنے کے بعد رہ جاتے ہیں۔ بے ڈھنگے جسم کے دونوں طرف ٹنڈ منڈ بازو لٹک رہے تھے۔ ڈوبتے سورج کے سارے رنگ اس کی کھال سے پھسل کر یوم رینگ کی طرح واپس سورج کے حلق میں ٹپک رہے تھے؛ صرف پیازی رنگ تھا کہ کھال سے چپکا تھا۔ لمبی گردن کے آخر میں بڑا سا سر جس میں گول گول آنکھیں رتھ کے پہیے تھے۔ چونچ اوپر تلے رکھی دو کرکیوں سے بنی تھی۔ وہ اپنے سوکھے ہوئے پنجے ناپ تول کے زمین میں گاڑ کر چلتا تھا۔ اس کی چونچ زمین کے ہر دانے کو پرکھتی، اٹھاتی، پھر اسے وہیں چھوڑ کر اگلے دانے کی طرف بڑھ جاتی۔ قدم اٹھاتے اٹھاتے اس کا ٹنڈ منڈ بازو اس کے سامنے آجاتا، اس کی طرف گردن جھکتی، بازو کے سرے کو چونچ میں لینے کی غرض سے وہ اپنے پنجوں پر گھومتا گھومتا لٹو بن جاتا، پھر اس سعیِ لاحاصل سے اکتا کر اگلے دانے کی طرف چونچ بڑھاتا۔ غول کے پرندے اس سے بے تعلق جلدی جلدی اپنے پوٹے بھر رہے تھے اور اپنے اپنے بسیروں کو جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ پرندہ دانوں کی پرکھ میں مصروف تھا۔

س۔ف۔س کا منہ حیرت میں کھلا تھا۔

اس نے اس قسم کا پرندہ، کہ وہ پرندوں سے نکل کر آیا تھا، آج تک نہیں دیکھا تھا۔ تاریک، خنک، سرخ پھولوں سے لدے دھاڑتے ہوئے جنگلوں کے سیاہ آسمان پر اڑتا ہوا وہ پسینے، دھان اور بارود کی بو میں رچے، سبز غلاف میں لپٹے پیازی آسمان پر آیا تھا۔ اس کے سوٹ کیس پر ہر رنگ ہر ڈیزائن کے لیبل چسپاں تھے لیکن آسمان کی کسی وسعت میں اس کو یہ پرندہ نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا ہاتھ فوراً اپنے کیمرے کی طرف اٹھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ رول تو ختم ہو گیا ہے اور اس کے پاس فلم نہیں۔

تو پھر، تو پھر۔

اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

تو پھر میں اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ سنہری پنجرے میں ڈال کر اسے اپنی ماں کے جنم دن پر تحفہ دوں گا۔ یہ پرندہ بولتا بھی ہوگا۔ اس کے جسم کی طرح اس کی آواز بھی عجیب و غریب ہوگی۔ میری ماں یقیناً اس تحفے کو پسند کرے گی۔

پھر اُسے لطیفہ یاد آیا کہ کس طرح ایک امیر نے بے بہا رقم خرچ کر کے ایک گانے والا پرندہ

کسی دوسرے ملک سے اپنے گھر تحفے کے طور پر بھیجا۔ اگلے روز یہ جاننے کے لیے کہ پرندہ بحفاظت پہنچ گیا ہے یا نہیں ٹیلیفون پر اپنی بیوی سے پوچھا کہ پرندہ کیسا رہا۔ دوسری طرف سے چٹخارے دار آواز آئی:

——نہایت لذیذ۔

س ف س مسکرا دیا۔

اول تو یہ پرندہ میں خود لے کر جاؤں گا اور اگر ایسا موقع آ بھی گیا کہ ماں اپنے کانوں کے ذائقے پر زبان کے ذائقے کو ترجیح دے تو میں بھی اس ضیافت میں شریک ہو سکوں گا۔

وہ ذرا ہٹ کر، عین پرندے کے سامنے آ کے بیٹھ گیا۔ پرندے نے رک کر اُسے دیکھا، پھر گردن گھما کر غول کے پرندوں پر نگاہ ڈالی۔ پرندے ایک ایک کر کے زمین چھوڑ رہے تھے۔ کچھ درختوں کی طرف بڑھ رہے تھے اور کچھ محرابوں کی طرف۔ کرن اس پرندے کی کھال کو پیازی رنگ کا آخری چھینٹا دے کر بجھ گئی۔ پرندے کی آنکھیں پھر س ف س کی آنکھوں میں تھیں۔ درختوں سے تاریکی اترنے لگی تھی۔ س ف س اس خزانے کو جلد از جلد قابو میں لینا چاہتا تھا۔ اُس نے زمین سے چند دانے اُٹھا کر اس کے آگے بڑھائے۔ پرندہ چند قدم چل کے بالکل اس کے قریب آ گیا، غور سے ہاتھ میں پڑے دانوں کو دیکھا، پھر چونچ پرے کر کے آسمان پر پھیلی سرخی دیکھنے لگا۔

بیمار ہے کیا۔ اگر اس نے دانہ نہ کھایا تو پہلے اس کے پیازی گوشت میں دھان کا پانی سوکھے گا اور پھر —— لیکن اگر اس نے یہ دانہ نہ لیا تو اسے میرا اعتماد کیسے حاصل ہوگا اور میں اسے پکڑوں گا کیسے اور ——

س ف س نے بے صبری سے ہاتھ پھر اس کی چونچ کے آگے کر دیا۔ ننگے ٹنڈ منڈ پرندے نے گردن گھمائی اور گول گول آنکھوں سے پھر ہاتھ پر پڑے دانوں کو دیکھا گردن ذرا اور آگے بڑھائی پھر یک دم جھٹکے سے کرکی ماری:

——ای۔ ی۔ ی۔

اور س ف س کی چھنگلی سے گوشت نوچ کر ایک طرف ہو گیا۔

س ف س ہاتھ جھٹکتا اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پرندے کو غصے اور حسرت کی نگاہوں سے دیکھتا اپنی چھنگلی منہ میں ڈال کر چوسنے لگا۔ پھر اس نے جیب سے رومال نکال کر خون میں بھیگی

چھنگلی پر لپیٹ لیا۔ پرندہ پھر زمین پر اپنی پرکھ میں مصروف تھا۔ صحن میں اور کوئی نہیں تھا۔ س ف س کی چیخ سن کر دربان صحن کے دروازے میں آگیا۔ س ف س نے اسے اشارے سے سمجھایا کہ وہ اس پرندے کو پکڑنا چاہتا ہے۔ دربان نے پلٹ کر دیکھا۔ لوگ تھے۔ دروازے کے سامنے سے وہی معصوم سا لڑکا ان دونوں کو غور سے دیکھتا گزرا جس کی مسیں ابھی نہیں پھوٹی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی پتھر تھا۔ دربان اس لڑکے کو دیکھ کر جھینپ گیا۔ اس نے بے بسی کے اظہار میں کندھے جھٹک کے س ف س کو اشاروں میں سمجھایا کہ وہ اس پرندے کو کیسے پکڑ سکتا ہے اور واپس اپنی جگہ پر چلا گیا۔

س ف س نے بازو بڑھا کر کہنیاں باہر نکالیں، پرندے پر اپنے ہاتھوں کا سایہ کیا، یہ دیکھنے کے لیے کہ پرندہ بڑھتے ہاتھ دیکھ کر نیچے سے نکل بھاگتا ہے یا نہیں۔ پرندہ اپنی غذا کی تلاش میں سرگرداں پھر اپنے پنجوں پر گھومتا اپنے بازو کا پیچھا کر رہا تھا۔ س ف س نے موقع غنیمت جانا۔ آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھا کر پہلے اس کی گردن کو پکڑ کے فوراً چونچ کو قابو کیا پھر دوسرے ہاتھ سے اس کے پنجے پکڑ لیے۔

میں تمھیں اپنے گھر لے جا رہا ہوں۔ وہاں میں تمھیں اچھی اچھی غذا کھلاؤں گا۔ تمھارے جسم پر پر نکلیں گے، تم سنہری پنجرے میں بیٹھ کر بہاروں کے گیت گاؤ گے اور ماں کو خوش کرو گے۔

پرندہ اس کے بازوؤں میں لحظہ بھر کے لیے تڑپ کر ساکت ہو گیا۔

س ف س نے دربان کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے مڑ کر دیکھا لیکن دربان مقبرے کی چھتوں سے پھیلتی تاریکی میں نظر نہ آیا۔ وہ اس کو دوسری مرتبہ دیکھنے کی کوشش کیے بغیر پرندے کو بغل میں داب کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر آگیا۔

اس کے شوفر نے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ س ف س اچھلتے دل سے کار میں بیٹھ گیا۔ شوفر کار کا دروازہ بند کرنے ہی والا تھا کہ کار کے اندر جلتی روشنی میں اس کی نظریں س ف س کی گود میں جا پڑیں۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اس نے قریب قریب چیختے ہوئے پوچھا:

—صاحب یہ کیا ہے؟

—پرندہ۔ مقبرے سے لایا ہوں۔

شوفر س ف س کا جواب سُننے کے بجائے اس کی چھنگلی پر بندھے سرخ ہوتے رومال کو دیکھ رہا تھا۔

ـــ ہائیں ـــ آپ کی اُنگلی کو کیا ہوا۔

ـــ کچھ نہیں۔

س ف س مسکرایا۔

ـــ دوست نے کاٹ کھایا۔ چھنگلی کے عوض منہگا نہیں۔

ـــ صاحب چھوڑ دیں اسے۔ یہ بہت خطرناک جانور معلوم ہوتا ہے۔

ـــ جانور؟ یہ پرندہ ہے بے وقوف۔ یہیں سے ہے۔ پہلے کبھی نہیں دیکھا تم نے؟

ـــ نہیں صاحب، آج تک نہیں دیکھا۔ کیا بڑی آنکھیں ہیں اس کی۔ ان میں اپنا عکس صاف نظر آتا ہے۔ اس کی تلوار سی چونچ۔ توبہ، مجھے تو خوف آتا ہے۔

ـــ گھبراؤ نہیں، اب یہ کچھ نہیں کہے گا۔ تم باتیں نہ بناؤ، ہوٹل چلو۔

س ف س نے بے صبری سے کہا۔

ـــ پہلے ہسپتال نہ چلیں؟ آپ کی اُنگلی!

ـــ نہیں معمولی زخم ہے، تم فوراً چلو۔

ـــ صاب میری مانیں تو

شوفر اگلا دروازہ کھول کر اپنی سیٹ پر آگیا۔

ـــ او، بکومت۔ تم چلوگے یا نہیں؟

شوفر نے چابی گھمائی اور کچھ سوچ کر کہا:

ـــ صاحب آپ کے ملک میں چڑیا گھر والے تو اس کی بڑی قیمت دیں گے۔

اس نے پیار سے پرندے کو دیکھا:

ـــ ہوں۔ فی الحال میں اسے گھر لے جاکر کھلاؤں پلاؤں گا اور پھر۔ معلوم ہوتا ہے صدیوں سے بھوکا ہے۔

شوفر نے کار سٹارٹ کی۔ پرندہ س ف س کو غور سے دیکھے جارہا تھا۔ کار چلنے لگی تو پرندے نے یک دم سر اُچک کر اس کے ہونٹوں پر وار کیا۔ کرکی ہونٹوں سے پھسل کر گال کو چیر گئی۔

ـــــ رکنا ذرا ـ یہ پھر شروع ہوگیا ہے ـ

شوفر انجن بند کرکے فوراً کار سے اترا اور پچھلا دروازہ کھولا ـ

ـــــ صاب اسے فوراً پھینک دیجیے ـ

پرندہ س ف س کی گود میں بے طرح پنجے مار رہا تھا ـ اسے قابو کرنے کی کوشش میں اس کے ہاتھ بری طرح زخمی ہوگئے ـ

ـــــ میری مدد کرو شوفر ـ بس ـ بس ـ قابو ـ

ـــــ میں اسے نہیں چھوؤں گا ـ اسے پھینک دیجیے ـ دیکھیے آپ کس طرح لہو لہان ہورہے ہیں ـ

ـــــ کیسے چھوڑ دوں ـ یہی تو میرے اتنے طویل سفر کا انعام ہے ـ

پرندہ دیوانہ وار تلوار چلا رہا تھا ـ پہلے زخم سے رومال کھل گیا تھا ـ چھنگلی باریک ریشے کے ساتھ ہاتھ سے لٹک رہی تھی ـ

ـــــ بس ـ بس ـ میں تمھیں بہت کچھ کھلاؤں گا ـ

پرندے کے کان نہیں تھے ـ وہ چیختا ہوا اس کے بازوؤں پر وار کررہا تھا ـ اس کی آنکھیں سُرخ تھیں ـ پیازی کھال کے نیچے سرخ لہو میں مدوجزر تھا ـ

ـــــ مدد ـ

س ف س نے شوفر کو پکارا ـ شوفر نے جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھائے اور س ف س کی گود سے پرندے کو اُٹھا کر پوری قوت سے باہر فٹ پاتھ پر پٹخ دیا ـ پرندہ پیٹھ کے سہارے گرا ـ ایک لمحے کے لیے اس کے پنجے ہوا میں لرزے اور وہ پھر پلٹ کے پنجوں پر کھڑا ہوگیا ـ شوفر نے اسے ٹھوکر مارنے کے لیے پیر اٹھایا ـ پرندہ ٹنڈ منڈ بازو اُٹھا کر اپنے نئے مدمقابل کی طرف بڑھا ـ شوفر بھاگ کر کار کی اوٹ میں ہوگیا ـ سڑک پر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا تھا ـ سب تماشا دیکھ رہے تھے ـ پرندہ بڑی تیزی سے بھاگتا ہوا اُچک کے کھلے دروازے سے کار پر چڑھ گیا ـ س ف س کی آنکھوں میں تاریک، خنک سرخ پھولوں سے لدے دھاڑتے جنگل اور پسینے، دھان اور بارود کی بو میں رچے رنگ ناچنے لگے ـ

س ف س نے اپنے ہاتھوں سے وار روکنا چاہا لیکن پرندے نے اپنی گردن جھکا کر ہاتھوں کے نیچے سے اس کے سینے کو نوچ لیا اور نوچتا رہا ـ بڑی مشکل سے س ف س نے اُٹھ کر اُسے ٹھوکر ماری اور ہانپتا ہوا لہو سے تر سیٹ پر گر گیا ـ

اس نے نیلے کانچ سے بنتے اسرار پر پڑتے پردوں کی اوٹ سے دیکھا: شوفر پرندے کو ٹانگوں سے پکڑ کے فٹ پاتھ پر پٹخا رہا تھا۔ پھر یک لخت کسی نے پتھر مارا۔ شوفر کا ماتھا پھٹ گیا اور وہ معصوم لڑکا، جس کی مسیں ابھی نہیں پھوٹی تھیں، جس کا چہرہ وہاں کی زمین تھا: سوندھی سوندھی باس، گندمی گندمی مٹی، نصف کرۂ ارض پر محیط، آگے بڑھا۔ اس نے شوفر سے پرندے کو چھین کر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے سر کو چومتا ہوا ایک طرف کو ہولیا۔

——جیوڈاس۔

س ف س کے ہونٹ نقاہت میں لرزے۔

——سو ڈاکٹر —— یہ ہے سارا قصہ۔

——یو بلڈی باسٹرڈ۔

ڈاکٹر نے زیر لب کہا اور مقامی خون سے بھری بوتل کی نالی کا کلیمپ کھول دیا۔

O

انور سجاد

# کونپل

بھرے بھرے چہرے پر جابرانہ انداز میں کھینچی آنکھیں بھینچے ہونٹ سیاہ نکٹائی کی امریکی گرہ میں پھنسی دوہری گردن، سیاہ کوٹ کی دائیں طرف، سینے کی جیب میں ریشمی رومال جس کا سُرخ رنگ وقت کے ساتھ ساتھ فیڈ ہوتا اب پیازی سا معلوم ہوتا ہے۔ داخلی دروازے کے سامنے دیوار پر کیل سے لٹکی اس پورٹریٹ کے فریم کے وائیں کونے پر چھپکلی کا داہنا پانو پڑتا ہے۔ تصویر لحہ بھر کے لیے لرزتی ہے۔ کوٹ کے کالر کے کاج پر ایک سنہری پتنگا بیٹھا ہے جو بلب کی روشنی میں بالکل کسی تمغے کی طرح لشکتا ہے۔ چھپکلی اس کی گھات میں وہیں جم جاتی ہے۔

دیوار، چھپکلی، پورٹریٹ، پتنگا ایک ہی حقیقت کے انگ دکھائی دیتے ہیں۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس، اس علاقے کا انچارج میز پر جُھکا، بے ضابطے کی کاروائی سرکاری سیاہی چوس پر سرکاری سیاہی سے تحریر کرتا ہے۔ سیاہی چوس پر پہلے ہی سے بنے چند اور کیڑے مکوڑوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس کی گردن اور بھی تن جاتی ہے۔ اسے وہاں کھڑے جانے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ اسے ہلنے تک کی اجازت نہیں، اس کے بالکل پیچھے ایک قدم ہٹ کے دو سیاہ پوش دائیں بائیں بید لیے کھڑے ہیں۔ جب بھی وہ تھک کر اپنا پورا بوجھ دونوں میں سے کسی ایک ٹانگ پر ڈالنا چاہتا ہے ان دونوں کے ہاتھوں میں پکڑے بید زناٹے سے ہوا کو چیرتے ہیں۔ اس کی مضبوط پنڈلیوں پر پڑکے اُچھلتے ہیں، جبڑوں کے تمام پٹھے تن جاتے ہیں، نظریں سامنے کوٹھری کے دروازے کی سلاخوں سے پار، تاریکی کو چیر کے کھڑکی کے راستے راہ پاتی ہیں۔

ـــــ میں ابھی لوٹ آؤں گا۔

وہ اپنے بچے کو سینے سے ہٹاکر بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔ بیوی گم سم اسے دیکھتی ہے، بچہ بھاگ کر صحن میں چلا جاتا ہے۔

ـــــ تم نے کیا جرم کیا پتر؟

اس کی ماں کے سفید بال صحن سے آتی ہوئی سرد ہوا سے کانپتے ہیں۔

ـــــ ہمارے خاندان میں آج تک کوئی ـــــــ تم نے کیا کیا ہے؟

بیوی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں، بچہ سردی سے بے پروا بے حد خوش چوکڑیاں بھرتا صحن سے واپس آتا ہے۔

ـــــ ابا، ابا وہ، وہ

بچہ باہر کی طرف اشارہ کرتا ہے اُسے بتاتا ہے کہ جو بیج اس نے اپنے بیٹے کو بونے کے لیے دیا تھا اس کی کونپل پھوٹ پڑی ہے۔

کچے صحن کے عین وسط میں چھوٹے سے دائرے کی صورت چنے کنکروں کے درمیان گوڑی شدہ زمین میں ایک ننھی منی کونپل منوں مٹی کو اپنی تیز کٹار سی نوک سے چیر کے اُبھری ہے۔

ہاں بیٹے وہ، اس میں ایسے ایسے موہنے لہکتے سرخ سرخ پھول فانوسوں کی صورت میں کھلیں گے۔ وہ بچے کو پھر سینے سے لگا کر بھینچتا ہے، الگ کرتا ہے، بیوی کو بھرپور نظروں سے دیکھ کر ماں کو یقین دلاتا ہے۔

ـــــ ماں میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ جانے مجھے کیوں بلانے آئے ہیں۔ ابھی لوٹ آؤں گا۔

پھر یکدم مڑتا ہے

ـــــ باہر سردی ہے بیٹے، سوئٹر پہن لو۔

بچہ چارپائی پر کھڑا ہے۔ بیوی کا ہاتھ اسے روکنے کے لیے اٹھتا ہے۔ دروازے کا سہارا لے کر ماں کا دل سسٹولی میں رکتا ہے۔ وہ ان سب کو ٹابلو میں چھوڑ کر تیزی سے قدم اٹھاتا باہر سڑک پر آجاتا ہے۔ دو سیاہ پوش عملاً اسے اٹھاکر جیپ میں پھینک دیتے ہیں۔ جیپ چل پڑتی ہے۔ آگے ڈرائیور کے ساتھ انچارج بیٹھا ہے۔ اس کا چہرہ نظر نہیں آتا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے چار سیاہ پوشوں نے اپنے گھٹنوں کے درمیان رائفلوں کو جیپ کے فرش پر کھڑا کرکے ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ تھام رکھا ہے۔ وہ ان کے درمیان پھنسا

بیٹھا اس قدر وی۔ آئی۔ پی ٹریٹ منٹ پر حیران ہوتا ہے۔ جیپ تیزی سے شاہراہوں پر گہری ہوتی ہوئی شام کی سیاہی پھیلاتی بھاگنے لگتی ہے۔ آسمان پر پھیلتے تاریک بادل ونڈسکرین کے فریم میں مہیب صورتوں میں اٹھتے ہیں۔ اسے فوراً خیال آتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو بتا کر کیوں نہیں آیا کہ تند ہوا تیز بارش اس کی کونپل کے لیے قاتل ہیں۔ جب تک یہ کونپل درخت نہیں بن جاتی اور اس پر موہنے مہکتے، سرخ سرخ پھول فانوسوں کی صورت میں نہیں جھومتے تب تک ــــــــ

مجھے اس کو بتا کر آنا چاہیے تھا۔

اس کی نظریں کوٹھری کی کھڑکی سے پلٹتی ہیں۔ پورٹریٹ کے دائیں کونے پر چھپکلی کا پاؤں اسی طرح جما ہے۔ آنکھیں پتنگے پر گڑی ہیں۔ چھپکلی کی دم کا اخیری سرا دیوار پر ایک ملی میٹر سرکتا ہے۔ پورٹریٹ میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ دیوار کی کیل پر تنی رسی، جس سے یہ پورٹریٹ ٹنگی ہے، ذرا سی تنتی ہے۔ کیل پر محیط رسی کے نچلے زنگ آلود، بوسیدہ حصے کے چند تاگے ٹوٹتے ہیں۔

انچارج اپنی کلائی گھما کر وقت دیکھتا ہے، سردی کو دونوں ہاتھوں میں رگڑتا ہے، دروازے کی جانب دیکھتا ہے۔ ایک کونے سے مبہم سی آواز آتی ہے۔

وہیں اسی جگہ کھڑے کھڑے اس کی آنکھیں خود بخود کونے کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ اس کا لہو اس کے جسم میں رک جاتا ہے۔ آنکھیں وہیں گڑ جاتی ہیں، پتلیاں پھیل جاتی ہیں۔ اس کونے میں بنچ پر بیٹھی اس کی ماں اور بیوی اس کو تکے جاتی ہیں۔ وہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتا ہے۔ ساتھ ہی اس کا قدم ان کی جانب بڑھنے کے لیے اٹھتا ہے۔ شاڑ، شاڑ۔ بید ہوا کو چیرتے اس کے جسم پر برستے ہیں وہ پھر وہیں جم جاتا ہے، اسے ملنے کی اجازت نہیں۔

ــــ انھیں یہاں کون لایا ہے۔

اسے کوئی جواب نہیں دیتا انچارج اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے کا ارادہ کرتا ہے پھر چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر پورٹریٹ کو دیکھنے لگتا ہے۔

پورٹریٹ مزید دو سوت نیچے سرک چکی ہے، پتنگا کوٹ کے کاج پر اسی طرح جما بیٹھا ہے چھپکلی کے دونوں اگلے پیر اب فریم کو پار کر چکے ہیں۔ اس کا بایاں پچھلا پیر فریم کے کونے کے قریب ہے۔ دائیں ٹانگ دم کی سیدھ میں کھنچی ہے۔

—— بچے کو اکیلا ہی چھوڑ آئی ہیں۔

وہ بیدوں کے پے بہ پے وار سہتا، بنچ پر بیٹھی عورتوں سے تشویش بھرے لہجے میں پوچھتا ہے۔

—— اس کے پاس ماسی کو چھوڑ ——

—— میں نے کہا تھا تم بولوگی نہیں۔ اگر اب تم میں سے کوئی بھی بولا اس کی زبان کاٹ دی جائے گی۔

انچارج کی نظریں پتنگے کے پروں کا سونا چاٹنے کی خواہش میں، پلٹ کر بڑی بیدردی سے کاٹتی ہے۔ ماں، بیوی سہم جاتی ہیں۔

—— یہ بڑی زیادتی —— ان شریف عورتوں کو یہاں کیوں

—— شریف عورتیں؟

انچارج کے گلے میں قہقہوں کا جھاگ اُبلتا ہے۔ وہ جاروں اور ماں بہنوں کی گالیاں تھوکنے لگتا ہے۔

—— تمہاری ماں بہن شریف عورتیں؟

اس کے بدن کے لہو میں طوفان آجاتا ہے۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ وہ بڑھ کر انچارج کو ——

لیکن دونوں سیاہ پوش اسے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں۔ تیسرا ایک نیم روشن کونے سے برآمد ہوتا ہے، دونوں ہاتھوں سے اس کی قمیض کو گریبان سے پکڑ کر پھاڑ دیتا ہے۔ پھٹی قمیض سے اس کے صحت مند تندرست سینے پر سردی کی سنسناہٹ پھیلتی ہے، اس کے جسم کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔

تیسرا سیاہ پوش اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہے باقی دونوں اسے دھکیلتے ہیں۔ ماں بیوی اسے دیکھتی ہیں پر چپ ہیں۔ تینوں سیاہ پوش اسے کمرے کی واحد کھڑکی کے پاس لاتے ہیں۔ ان میں سے ایک اس کی قمیض کے رہے سہے چیتھڑے بھی اتار پھینکتا ہے۔ کھڑکی سے آتی تیز سرد ہوا اس کے جسم کے مساموں میں داخل ہو کر سر اٹھاتی ہے۔ وہ جسم سے اٹھتی کپکپی کو جسم میں دبا دیتا ہے۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر دونوں ہتھیلیاں جما کر سینہ پھلاتا ہے۔ لمبا سانس بھرتا ہے۔ اب آسمان پر بادل پوری طرح جم چکے ہیں۔ مدھم مدھم

کومل سرمئی سی روشنی جو تاریک سے تاریک رات میں بھی کہیں سے آجاتی ہے، کڑکتی کوندتی برق کے سامنے ہر لمحہ غائب ہوتی ہے۔ ان لمحوں کے بیچ کے لمحے میں پھر آسمان کی وسعتوں میں پھیل جاتی ہے۔ اس درمیانی لمحے کو وہ اپنے سارے وجود میں سمیٹ کر مسکراتا ہے۔ پلٹتا ہے۔ نظروں ہی نظروں میں ماں اور بیوی کو صبر کی تلقین کرتا ہے۔

___ آپ مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہیں؟

وہ بے صبری سے پلٹ کر سوال کرتا ہے۔

___ آپ مجھے جانے دیں گے یا نہیں۔ میرا بچہ گھر میں تنہا ہے۔

ایک سیاہ پوش ہاتھ میں پلاس لیے اس کی طرف بڑھتا ہے۔ یکایک اس کا بایاں ہاتھ پکڑ کر پینترہ بدلتا ہے۔ اس کا بازو اپنی بغل میں لے کر سختی سے دبا لیتا ہے۔ باقی سیاہ پوش اس کی طرف جھپٹتے ہیں۔ اسے زمین پر گرا کر اپنے قابو میں لے لیتے ہیں۔ پلاس والا اس کی شہادت کی انگلی کا ناخن پلاس کے دانتوں میں دبا کر آہستہ آہستہ کھینچتا ہے، کھینچتا ہے حتیٰ کہ ناخن جڑ سے اکھڑنے لگتا ہے۔ درد کی تمام حسیات سمٹ کر اس کے ناخنوں میں آجاتی ہیں۔ اس کے اندر کا ایک ایک خلیہ تناؤ میں جھنجھنا اٹھتا ہے، لیکن وہ اپنے چہرے پر اذیت کا کوئی تاثر نہیں آنے دیتا۔ انچارج غور سے اس کے چہرے کو دیکھتا ہے۔

وہ خود ہی دل میں حیران ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ پہلے کبھی جسمانی اذیت سے دو چار نہیں ہوا تھا۔ اب یہ کیسی شناسائی ہے کہ اذیت اجنبی محسوس نہیں ہوتی شاید جسم اور دماغ کے ہم آہنگ ہونے پر دونوں حقیقتیں دونوں اذیتیں ایک ہوجاتی ہیں۔ انچارج سیاہ پوش سے پلاس چھین کر دیوانہ وار اس کا ہر ناخن کھینچتا ہے کھینچتا ہے۔ اس کے ناخنوں کے کناروں پر خون کی لکیریں ابھر کے محیط ہوجاتی ہیں۔ انچارج تھک کر لرز جاتا ہے پلاس تان کر اس کے پیٹ پر مارتا ہے، گالیاں دیتا ہوا سیاہ پوشوں کے ساتھ کانفرنس کرنے کے لیے پرے ہٹ جاتا ہے۔ ماں بہن کی گالیاں سن کر ماں بیوی کے سر اور بھی جھک جاتے ہیں۔

وہ اپنے اذیت رسانوں کو مصروف دیکھ کر یکدم کروٹ بدلتا ہے۔ فرش پر پنجوں اور ہتھیلیوں کے بل چپکے سے چلتا ماں اور بیوی کے قدموں میں جا پہنچتا ہے۔

___ بچہ تو محفوظ ہے نا؟ بوڑھی ماسی اس کا خیال ___

ماں اور بیوی اسے ٹکر ٹکر دیکھتی ہیں۔ وہ کولھوں کے سہارے بیٹھ کر جلدی سے

اپنے ہاتھ بغلوں میں داب لیتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں چلتے پانی کی لکیر دوڑ جاتی ہے۔
——بچہ تو محفوظ ——

عین اسی وقت آسمان سے بارش کے پہلے قطرے کا فائر ہوتا ہے۔ بارش مشین گنوں سے چلتی گولیوں کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ بچہّ اپنے لحاف کو ذرا سا اٹھاکر دوسری چارپائی کی اور دیکھتا ہے۔ بہتّر سال کی بوڑھی ماسی لحاف میں دبکی تیند میں غائب غلا ہے۔ بچہ بہت محتاط، چارپائی کی چرچراہٹ کو دھیرے دھیرے اپنے بس میں کرتا ہے۔ دبے پانو چل کر دیوار سے لگا اسٹول اٹھاتا ہے۔ بند دروازے کے سامنے رکھ کر اس پر چڑھتا ہے۔ آہستہ آہستہ کنڈی کھولتا ہے۔ دوسری چارپائی پر قبرسی بنی لحاف کی نیند میں غائب غلا بہتّر سال کی ماسی کو دیکھتا ہے۔ کنڈی کھول کر وہ جلدی سے نیچے اتر کر اسٹول کو پھر دیوار کے ساتھ لگا دیتا ہے۔ دروازے کا ایک پٹ کھول کر باہر جھانکتا ہے۔ دیواروں سے اچھلتی بوچھار اس پر پڑتی ہے۔ ٹھنڈی یخ بستہ ہوا اس کی ناک کی پھننگ سے ٹکراتی ہے۔ بچہ بڑی مشکل سے چھینک کو دباتا ہے۔ اسے صحن میں کونپل نظر نہیں آتی۔ اس کا دل زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تیز بارش کا پردہ ہے۔ کارپوریشن کے کھمبے پر جلتے بلب کی روشنی نے بارش کی چادر پر پھیل کر اسے اندھا شیشہ بنا دیا ہے۔ بچے کے جسم میں سردی کی سنسنی پھیل جاتی ہے۔ اس کو چھینک آہی جاتی ہے۔ دوسرے بستر پر بنی قبر میں جنبش ہوتی ہے۔ بچہّ روہانسا ہوکر فوراً اپنے بستر میں دبک جاتا ہے۔ لحاف کی اوٹ سے ماسی کو دیکھتا ہے۔ ماسی پھر اپنی نیند میں قائم ہوچکی ہے۔

بچے کا دل مسلسل دھڑکے جاتا ہے، جانے باہر تیز بارش تند ہوا میں اس کے نئے نویلے بوٹے کا کیا حال ہوگا۔ اگر اس بوٹے کو کچھ ہوگیا تو؟ اس سے رہا نہیں جاتا۔ وہ بےچینی میں اٹھ کر اپنی تمام حرکات دہراتا ہے۔ دروازے میں کھڑا ہوکر اندھے شیشے سے پار دیکھنے کی سعی کرتا ہے۔ دیواروں سے ٹوٹتی پھوار اسے شرابور کر دیتی ہے۔
اب ہوا کا رخ کھڑکی کی طرف ہے۔ جہاں اسے پھر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ تیز ہوا اس کے جسم پر بارش کی چاند ماری کرتی ہے۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے جسم کے انچ انچ کو کٹے ہوئے بلیڈ چھیدتے ہیں پھر جلد ہی اس کے جسم اور دماغ کی حقیقتیں ایک ہوجاتی ہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنے سن جسم پر بلیڈوں کے وار سہتا ہے۔

ماں اور بیوی میں اسے دیکھنے کی تاب نہیں۔ ان دونوں کی نظریں پورٹریٹ پر گڑی ہیں۔
ان کے چہروں پر نفرت اور حقارت غم وغصّے کے تاثرات ہیں۔ چھپکلی پوری کی پوری پورٹریٹ
کے فریم کے شیشے پر آچکی ہے۔ سنہری پتنگا کاچ پر تمغہ نہیں رہا۔ رفتہ رفتہ چلتا ہوا سرکے
اس حصّے پر آکے رک گیا ہے۔ جہاں سے بال چھدرے ہوتے ہوتے ماتھے میں ڈھل جاتے
ہیں۔ چھپکلی کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ وہ اگلا دایاں پانو بڑھائے، پچھلی بائیں ٹانگ دم کی
سیدھ میں تان کر گھات لگالیتی ہے۔ کیل کے اوپر بوسیدہ زنگ آلود رسی کے چند اور
تاگے ٹوٹ جاتے ہیں، پورٹریٹ چارسوت کشش ثقل کی طرف کھسکتی ہے۔

اذیت خانے کا داخلی دروازہ کھٹکے سے کھلتا ہے۔ انچارج اور تمام سیاہ پوش
اٹن شن ہوجاتے ہیں۔ وہ بھی کھڑکی سے پلٹ کر دیکھتا ہے سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک شخص
برساتی اوڑھے، کار سے اُتر کر دو سیاہ پوشوں کی معیت میں داخل ہوتا ہے۔ برساتی اتار کے
ایک سیاہ پوش کو تھما دیتا ہے۔ کوٹ کی جیب سے پائپ نکال کر منہ میں دباتا ہے۔ اس کے
سامنے چھے فٹ کے فاصلے پہ کھڑا ہوکر گیس لائٹر سے پائپ سلگاتا ہے۔ دھوئیں کے چھوٹے
چھوٹے بادل اس کے منہ سے نکلتے ہی کھڑکی سے آتی ہوا میں منتشر ہوجاتے ہیں۔

کونے سے رونے کی دبی دبی آواز آتی ہے۔ اس کی بیوی اپنے رومال کو منہ میں ٹھونسے،
تھک ہار کر چھلکتے صبر کے پیمانے کو چھلکنے سے روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ پائپ والا منہ سے
پائپ نکال کر اس کی جانب دیکھتا ہے۔

——گڈ——

انچارج بڑے فخر سے اپنی کارگزاری سناتا ہے۔ پائپ والے کا چہرہ مطمئن ہے۔
وہ پائپ والے کی طرف لپکتا ہے۔ دو سیاہ پوش فوراً بڑھ کر اسے پکڑ لیتے ہیں۔

——میرا جرم—— میرا جرم؟ یہ لوگ——

انچارج کی تیز زبان اسے کاٹتی ہے۔ ماں بہن کی گالیاں۔ ماں بیوی کے سر زمین پر جھکے
اُٹھ نہیں پاتے۔ انچارج کے اشارے پر ایک سیاہ پوش کونے میں پڑے کڑوے تیل کے کنستر
میں ڈوبا کوڑا نکالتا ہے دو بڑھ کے اسے گھسیٹ کے تاریک کوٹھری کے جنگلے کے ساتھ اس کی
کلائیاں اور پیر باندھ دیتے ہیں، کچھ اس انداز میں جیسے یسوع مسیح کو سولی پر باندھا گیا تھا۔
سیاہ پوش کوڑے سے زائد تیل نچوڑ کر پائپ والے کو اجازت طلب نظروں سے

دیکھتا ہے۔ پائپ والا منہ میں پائپ رکھ کر کش لیتا ہے۔ سیاہ پوش کوڑا لہراتا ہے۔

پہلا وار

اس کے دانت اور آنکھیں بھینچ جاتے ہیں۔ پشت کے ریشے لمحہ بھر کے لیے سُن ہو کر تڑپتے ہیں۔ وار کے بعد اس کا منہ کھلتا ہے۔ آنکھیں جنگلے کے باہر کوٹھری کے اندھیرے میں شعلے پھینکتی ہے۔

دوسرا وار، تیسرا، چوتھا۔

اب اس کی پیٹھ کے پٹھوں کے تمام ریشے مسلسل تناؤ میں ہیں۔ اس کی آنکھیں مسلسل بھینچی ہیں، جن کے سامنے مرکز سے سرخ نقطہ اُبھرتا ہے، افق سے افق تک تنتا ہی چلا جاتا ہے۔ چیخیں ہر وار پر اس کے گلے میں آ کے اٹک جاتی ہیں۔ پائپ والا حیران ہے کہ اتنی اذیت کے باوجو یہ چیختا کیوں نہیں۔ اس کی ماں اور بیوی اس منظر کی تاب نہ لا کر بینچ پر بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کے کاندھے پر سر رکھ کے آنکھیں میچ لیتی ہیں۔ ماں، دوسرے ہاتھ سے اپنی گرم چادر کے دامن میں اپنی بہو کے سر کو بھی چھپا لیتی ہے۔

کوڑے مارنے والا ہانپ کر بیٹھ جاتا ہے۔

اس کے پٹھوں کا تناؤ ختم ہو جاتا ہے۔ آنکھیں کھلتی ہیں۔ وہ جس طرف دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے مرکز سے اُبھرتا سرخ نقطہ تاریکی کو روشن کرتا افق سے افق تک پھیلتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ تھکاوٹ سے چور، جنگلے سے بندھا، لٹک جاتا ہے۔

پورٹریٹ تین سوت اور نیچے لٹک گئی ہے۔ دو ایک تاگوں کے سوا رسی کے زنگ آلود حصے سے تمام تاگے ٹوٹ گئے ہیں۔ پورٹریٹ کے ماتھے پر چھپکلی اور پتنگے کے درمیان تین انچ کا فاصلہ رہ گیا ہے۔

ایک سیاہ پوش بڑھ کر اس کی کلائیوں اور ٹخنوں سے رسیاں کھولتا ہے۔ وہ بے جان، فرش پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ انچارج اپنے فل بوٹ کی نوک اس کی پیٹھ سے لگا کر زور سے دھکیلتا ہے۔

پائپ والا پلٹ کر سٹول پر بڑی دہکتے کوئلوں کی انگیٹھی پر، جو اس عرصے میں ان میں سے ایک لا کر رکھ گیا ہے؛ اپنے ہاتھ سینکتا ہے۔ انچارج میز سے کاغذات اٹھا کر اس کے سامنے کرتا ہے۔ پائپ والا پائپ کے چھوٹے چھوٹے کش لیتا، کاغذات کا

سرسری مطالعہ کرتا ہے۔ انچارج کو شاباش دیتا ہے۔ انچارج سیلوٹ کرتا ہے ۔اس کا جی بار بار سیلوٹ کرنے کو چاہتا ہے لیکن اس خیال سے کہ صاحب برا نہ مان جائے، ایک ہی سیلوٹ پر اکتفا کرتا ہے۔

ـــــ یہ لوگ مجھے بلا وجہ گرفتار کرکے لے آئے ہیں۔

پائپ والا مڑ کر اسے دیکھتا ہے۔ وہ فرش پر گھسٹتا اس کے قریب آتا ہے۔ چند قدم پرے رُک کر ہانپنے لگتا ہے۔ انچارج اور سیاہ پوش اس کی طرف لپکتے ہیں۔ پائپ والے کے ہاتھ کے اشارے سے رک جاتے ہیں۔

ـــــ بہت ڈھیٹ ہے۔

انچارج کے لہجے میں خفت ہے پائپ والا خاموشی سے فرش کو دیکھتا ہے۔

ـــــ آپ ـــــ آپ ـــــ پڑھے لکھے ہیں۔ افسر تو بعد میں بنے۔ مجھے یاد ہے طالب علمی کے زمانے میں آپ بھی ـــــ

ـــــ شٹ اپ، تم میرے بارے میں اتنا جانتے ہو!

پائپ والے کا چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ پیٹ کا سارا لعاب پل بھر کے لیے حلق میں پھنس جاتا ہے۔ پائپ کا کش لے کر وہ اس کیفیت سے نبرد آزما ہوتا ہے۔

فرش پر بیٹھے بیٹھے وہ دیوانہ وار قہقہے میں فرش پر جھک جاتا ہے۔ پائپ والے کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔

ـــــ خاموش۔

ـــــ جی اچھا۔ بہت بہتر و بہت مناسب ـــــ یہ بتایئے، میں چور ہوں، بدمعاش، غنڈہ، جواری، زانی، شرابی، قاتل، ڈاکو یا سمگلر ہوں، جو مجھے یہاں لایا گیا ہے؟

پائپ والا اطمینان کا سانس لیتا ہے کہ بات اس کی ذات پر پھیلتی خود ہی سمٹ گئی ہے۔

ـــــ یا میں اپنے وطن کے خلاف کسی سازش میں ملوث ہوں جو آپ مجھے اذیتیں دے کر سازش کی تفصیلات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

انچارج ایک طرف کھڑا دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگتا ہے کہ صاحب خواہ مخواہ اسے بکنے جانے کی اجازت دے رہے ہیں۔ وہ ابھی ایک سیکنڈ میں اس کی زبان بند کر سکتا ہے، لیکن پائپ والا اپنے ہر حکم کا جواز دینا چاہتا ہے اگر وہ جواز نہ بھی دے تو بھی

اس شخص کو جو فرش پر بیٹھا اپنے آپ کو شریف اور معزز شہری ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے، کوئی فرق نہیں پڑتا ۔

—— میری ماں ، میری بیوی کی بے حرمتی ——

وہ تقریباً روہانسا ہو جاتا ہے ۔

—— تمھارا صرف ایک جرم ہے ۔ تم کسان ہو، مزدور ہو، کلرک ہو، شاعر ہو، خطرناک قسم کے بلڈی پوئٹ ۔

—— میں بیک وقت یہ سب کچھ ؟!

—— ایک عرصے سے تم یہ سب کچھ ہو ۔ تمھاری فائل کہتی ہے ۔ آج دوپہر تم نے یہ ثابت بھی کر دیا ہے ۔

—— میں نے کچھ ثابت نہیں کرنا چاہا تھا ۔

—— تو پھر تم ہجوم کے درمیان چبوترے پر کھڑے کیا بک رہے تھے !

آواز کی آرزو ہیں، وہ خواہش ، وہ خیال ، وہ لفظ جنھیں میں نے اپنے سمیت اپنے وجود میں سمیٹ لیا تھا، آج ان کی نجات کا دن تھا ۔ اور میں ہجوم کے ساتھ مل کر اس حقیقت کا اعلان کر رہا تھا کہ ہم انسان ہیں، جانور نہیں ۔ ہم آزاد ہیں، غلام نہیں ۔

—— تم واقعی خطرناک شاعر ہو ۔

—— میں یہاں ایک ہوں ۔ اگر خواہشوں، خیالوں اور لفظوں کو آواز سے روشناس کرانا خطرناک ہے تو باہر سارا ہجوم، سارا شہر، سارا ملک، ساری کائنات خطرناک ہے ۔انھوں نے اپنے مقدر پر لگی ، جبر و استبداد کی مہریں توڑ ڈالی ہیں ۔

پائپ والا بڑے اضطراب سے پائپ کو منہ کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں جماتا ہے ۔

—— آپ کی بدنصیبی ہے کہ آپ نے مہریں لگانے والی مشین کا پرزہ بننا پسند کیا ۔

پائپ والا کچھ کہنا چاہتا ہے کہ وہ میز کا سہارا لے کر لڑکھڑاتا ہوا اٹھتا ہے ۔میز کے سہارے کھڑا ہو جاتا ہے ۔

—— تم بہت بولتے ہو ۔

پائپ والا جلدی سے پلکیں جھکا کر کہتا ہے ۔ سر کے اشارے سے انچارج کو بلا کر

اس کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ انچارج کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھتا ہے۔
دو سیاہ پوش اسے وہیں میز کے پاس فرش پر پھر سے گرا دیتے ہیں۔ دو اور ساتھ مل کر اسے پوری طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں۔ انچارج اس کے سینے پر چڑھ بیٹھتا ہے۔ اپنے مضبوط ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلیوں کو اس کے جبڑوں کے دونوں طرف جماکر پوری قوت سے دباتا ہے۔ وہ مدافعت کرتا ہے، لیکن اسے منہ کھولنا ہی پڑتا ہے۔ پائپ والا ایک چھوٹا سا دہکتا ہوا انگارہ پیڈ کے کلپ میں انگیٹھی سے اٹھاکر اس کے قریب لاتا ہے۔ انگارے کی حدت اور سرخی سے اس کی آنکھوں کو سکون پہنچتا ہے۔
—— تم واقعی بہت بکواسی ہو۔
پائپ والا اس کے کھلے منہ کے راستے دہکتا انگارہ اس کی زبان پر رکھتا ہے۔ کونے میں گرم چادر کے نیچے ماں اور بیوی ایک دوسرے کو بھینچ لیتی ہیں۔ وہ سیاہ پوشوں کے شکنجے میں جکڑا تڑپتا ہے، چیختا ہے۔ ماں بیوی کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہیں۔ پائپ والا انگارہ اُٹھا کے پھر رکھتا ہے۔ تاکہ اس کے منہ کے لعاب سے انگارہ بجھ جاتا ہے۔ پائپ والا کلپ سمیت انگارہ پرے پھینک کر بڑے اطمینان سے اُٹھتا ہے، سوچتا ہے —— اب یہ سدا کے لیے گونگا ہوگیا۔
عین اسی وقت پورٹریٹ کی رسی کا ایک اور تاگا ٹوٹتا ہے۔ پورٹریٹ چند سوت اور کشش ثقل کی جانب سرکتی ہے۔ اب صرف ایک تاگا رہ گیا ہے۔ جس کے سہارے پورٹریٹ کیل پر ٹنگی ہے۔ چھپکلی، اگلا دایاں پانو اُٹھائے، ماتھے کے تمغے، سنہری پتنگے پر اب جھپٹنا ہی چاہتی ہے۔ وہ فرش پر لیٹا اپنے جسم کے تشنج پر قابو پاکر حواس مجتمع کرتا ہے۔ اجتماع میں پھڑکتی جلی زبان سے ان تمام لفظوں کا سیلاب اُمڈ آتا ہے، جو آج دوپہر ہجوم کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ ہوئے تھے۔ درد، اذیت اور غصّے میں جلتی زبان سے لکنت میں اُبھرتے الفاظ، پائپ والے اور دیگر سیاہ پوشوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔
یہ سدا کے لیے گونگا ہوگیا۔ اپنی دانست میں ان بے معنی آوازوں کو سنتے ہوئے پائپ والے اور اس کے حواریوں کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیلتے قہقہوں میں پھٹ پڑتے ہیں۔ قہقہے، کونے سے اُبھرتی ماں اور بیوی کی سسکیاں، اس کی جلی ہوئی، لکناتی زبان سے دیوانہ وار نکلتے لفظ، اور باہر کڑکتی بجلی، سرد تڑتڑاتی ہوا پر تیز بارش کا متاثر۔

کارپوریشن لیمپ پوسٹ کی روشنی سے بنے، اندھے شیشے کے پار دیکھتے ہوئے بچے کو یکدم ترکیب سوجھتی ہے۔ وہ دروازے سے ہٹ کر جلدی سے مڑتا ہے۔ پل بھر کے لیے دوسرے بستر پر تنفس سے اُبھرتی ڈوبتی رضائی کی قبر کو دیکھتا ہے۔ اپنی چارپائی کے پاس آکر جلدی جلدی جوتا پہنتا ہے، اپنی پوری قوت سے، اپنے بستر کا لحاف اُٹھاکر اوڑھتا ہے۔ پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ صحن کے عین وسط میں پہنچ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور اُس ننھی منی کونپل کو اپنے لحاف کے دامن میں لے لیتا ہے، جو منوں مٹی کو اپنی تیز کٹار سی نوک سے چیر کے اُبھری ہے، اور درخت بننے پر جس کی شاخوں سے موہنے، مہکتے، سُرخ سُرخ پھول، فانوسوں کی صورت جھولیں گے۔

انور سجّاد

# مکّھی کا مونولاگ

سی۔ ایل چارسو اسی بہت عجیب مرکّب ہے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ تجربہ یہ منصوبہ فیل ہوگیا ہے لوگوں کو اجتماعی صورت میں دیکھنے سے ان پر وہی ردِّ عمل ہوا جس کی توقع تھی جوں ہی لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ان کی طرف بڑھا یہ سمٹتے گئے سمٹتے گئے حتّا کہ بعض تو دکانوں کے کونوں کھدروں میں جا گھسے جنھیں بڑی مشکل سے وہاں سے نکالا گیا پھر ان سب کو اپنی اپنی ڈبیوں میں بند کرکے واپس لایا گیا یہاں لاکر انھیں جب چھوڑا گیا تو ان میں سے ہر ایک پر رعشہ طاری تھا بصد مشکل سی ایل چارسو اسی کی ایک خوراک دے کر انھیں سکون فراہم کیا گیا جس کے بعد ان کے ذہنوں میں ایک مکمل تبدیلی ایک مکمل کایا کلپ نوٹ کی گئی یہ بیان کرنا مشکل ہے کیوں کہ جب وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں تو کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں پر ایک دوسرے کے حوالے سے ان کے لیے ابلاغ کا کوئی مسئلہ نظر نہیں آتا یوں لگتا ہے جیسے یہ خود کو لا انسان سمجھتے ہیں دل چسپ بات اس کا ان کا بہ غور مطالعہ کرنا چاہیے سی ایل چارسو اسی کو ان پر پوری طرح استعمال کرکے اس مرکب کی مزید خصوصیات دریافت کرنا چاہیے ایسے کئی کیس ریکارڈ میں موجود ہیں جو محض انفرادی طور پر خود کو جانور تصور کرتے تھے لیکن یوں اجتماعی طور پر ان کا گائے بھینس و دیگر مویشی بن جانا یقیناً سائنسی طور پر دل چسپی کا باعث ہے۔ ہوسکتا ہے میں اس نئے مرکب کی وہ خصوصیت دریافت کروں جو مجھے راتوں رات مشاہیر عالم کی صف میں لا کھڑا کرے لا انسان ؟ گائے بھینس چوپائے مویشی نہیں یہ تو اپنے آپ کو حشرات الارض میں سے متصور کرتے ہیں گڈ ویری گڈ یعنی سی ایل چارسو اسی کی ایک اور خصوصیت ونڈرفل کیڑے مکوڑے کالے کالے خاکی خاکی سبز سبز بے ضرر سی اشیا جو انسان سے اتنی ہی لا ہیں جتنا لا انسان سے بہت اچھی نشانی ہے ان میں سے انسانی خاصیت یعنی خود کو انسان منوانے کی جرات طاقت یعنی کمینگی کا مکمل اخراج ہوگیا ہے

یعنی جرات طاقت یعنی کیننگی کا پتا ہوگئی ہے لہذا انھیں کوئی غم نہیں کوئی دکھ کوئی لالچ کوئی پچھتاوا نہیں زخموں کے درد جلن خارش سے بلبلا کر سر اٹھانے سے عاری یعنی کیننگی کا مکمل مکمل اخراج لیکن مختلف اشیا میں ان کی دل چسپی بہ دستور قائم کیوں ہے مثلاً روٹی کے ٹکڑوں شکر کے دانوں سکّوں نمک کی کرسٹلوں کپڑوں سر کی چھتوں وغیرہ پر جگّر مزدور کاٹتے ہیں شاید ان اشیا کی طرف ان کی جبلی خطرناک صورتِ حال سی ایل چار سو اسی کی خوراک دوگنی تاکہ پر نہیں وہ یہ اشیا یعنی سکّوں وغیرہ کو بڑے ایکٹر کی طرح لقمے کے طور پر استعمال کرتے ہیں جس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنے ہاتھوں کو کیا کرے تو وہ سگریٹ نکال کر سلگا لیتا ہے اور پھر کھیل کے دوران اس سے کھیلتا رہتا ہے خدا کا شکر ہے کہ لقمے ان کے لیے اپنی اصلیت کھو چکے ہیں ورنہ سی ایل چار سو اسی کے سپلائر مجھے ناک آوٹ کر دیتے میں انشا اللہ حشرات الارض کی اس اشرف المخلوقات کے ذریعے سائنسی دنیا کو نئی دریافت سے متعارف کراؤں گا اپنے سینے پر تمغے سجاؤں گا انھیں مجبوراً مجھے نوبل پرائز دینا پڑے گا سائنس کا نہ سہی امن ہی کا سہی جاؤ جا کر ان کا ردّ عمل نوٹ کرو کہ یہ اجتماع کی اجتماعی صورتِ حال کی گواہی دے کر آئے ہیں ان کی حرکات و سکنات نوٹ کرو اگر ارض کے ان حشرات کی تکمیل ہو چکی ہے تو ایک اور کھیپ کو داخل کرو حتّاکہ دس کروڑ اب تو بارہ بلکہ پندرہ کروڑ ہو گئے ہوں گے شماریات کے لیے حشرات الارض کتنی مزوّری چیز ہے سمجھ میں نہیں آتا اجتماعی ایکٹی ویٹی کا اثر ان پر کچھ مختلف ہی ہونا چاہیے تھا ان میں سمندر کی لہریں کم از کم تھراہٹ بن کر ہی اتر جانا چاہیے تھیں تمام حفاظتی تدابیر کے باوجود فضاؤں میں ان کی آوازوں کے پرچموں کو گرجنا چاہیے تھا میرا خیال تھا لفظ آوازیں ہجوم کے متحرکتے ہوئے سانس جسموں میں ناچتے ہوئے بچھوؤں کے ریشے انھیں نئے معانی سے روشناس کرائیں گے لیکن جواب نہیں سی ایل چار سو اسی کا میرا تجربہ بے حد کامیاب رہا اب یہ پُرامن شہری اس کے سوا اور کچھ نہیں سوچ سکتے کہ یہ کالے کالے خاکی خاکی سبز سبز کیڑے ہیں نرم و نازک جو اپنے جسموں کو چاٹ کر ایک دوسرے کے جسموں کو چاٹ کر اس کی لذّت سے بھوک کو مارتے ہیں پیدائش پر رینگنا شروع کرتے ہیں پھر پیچیدہ انسانی ذمّے داریوں کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں معاملہ برعکس یہیں سے مصیبت اپنا سر اٹھاتی ہے یہیں میں داخل ہوتا ہوں کہ سر کو چار سو اسی تہوں میں دفن کر دوں چار سو اکاسویں تہ میں حشرات الارض کے مشاغل بہت امن پرور ہو جاتے ہیں میں اس لیے اتنے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ میں نے جب ہوش سنبھالا تو مجھے قد کاٹھ کے حوالے سے مکھی کا نام دیا گیا بھیں بھیں ہر طرف بھنبھناتا پھرتا تھا مکھی محض مکھی پر خلوص جذباتی کوئی کینہ نہیں کوئی بغض نہیں انسانی خاصیتوں سے کا بھیں بھیں مکھی آئی مکھی آئی پروں کی بھنبھناہٹ چار سو

استاد کے کندھے پر اس کے ڈیسک پر ڈیسک کے دراز میں الماری میں غسل خانے میں باورچی خانے میں ہر جگہ پہنچ جاتی ہے مکھی گھوڑے کی پیٹھ کے زخم پر لابنی سیاہ لیموسین کے اوپر اس کے اندر ہیلو ہیلو سی ایل چار سواسی ہم اس لیموسین کی سیر کا اعلان کرتے ہیں جس سے کیلشیئم اور فاسفورس کی بو آتی ہے یہ کیلشیئم اور فاسفورس کا مرکب ہڈیاں ڈھانچہ کہ جس کی سانس کی نالی تو گل سڑ کے فنا ہو چکی ہے لیکن کارخانوں کے اخراج پائپوں کے زہریلے ذرّات ابھی تک وہاں جمے ہیں کھوپڑی کے آنکھوں والے گڑھے اپنی گردن کی ہڈیوں کی سنگی پر ڈیموکلیس کی تلوار کی طرح لٹکے اس سگار پر گڑے ہیں جس پر میں بیٹھا ہوں سگار ان آنکھوں پر وار کرتا ہے میں سگار اور ڈھانچے کی جنگ کے نتائج کو بھول بھال کر شکر پر لپکتا ہوں مکھی آئی مکھی آئی لالچی شکر کی جانب ڈائیو بھیں بھیں

مکھی اپنی رفتار کی اسیر، شکر کو محض چاٹتی اسی زور و شور میں شکر کو عبور کر کے باہر نکل جاتی ہے اور ان حشرات الارض میں شامل ہو جاتی ہے جن کے رویوں کی ساخت کے نوٹس لینے کے لیے اپنے نائب کو بھیجا تھا، جو خود ان کالے کالے خاکی خاکی سبز سبز بے ضرر حشرت الارض کے گروہ میں شامل ہے جو اپنے جسموں کو چاٹتے ہوئے، ایک دوسرے کے جسموں کو چاٹتے ہوئے اس کی لذّت سے اپنی بھوک کو مارتے ہیں ۔

سی ایل چار سو اسی ایسا ہی عجیب مرکّب ہے ۔

O

انور سجاد

# یوسف کھوہ

جنگل، بیابان، تپتی ریت، جلتی دوپہر، دُور پانی کا کنواں اور سسست سی، ہیجان انگیز، دیوانہ کر دینے والی ــــــ ککوُ کوُ ــــــ

لمحہ بعد لمحہ، سال بعد سال، تیز سانسوں کی لالچی، عورتوں کو، سستن یخ مردوں کو جنگلی بنا دیتی ہے، ککوُ کوُ۔ ہوائی جہاز، ریل انجن، فیکٹریاں، ورکشاپیں، بسیں رکشے، عورتیں، بلیاں، بچّے منہ اُٹھا کر پکارتے ہیں ــــــ یوسف کھوہ۔ جب ہم سڑکوں پہ تنہا ہوتے ہیں، جب ٹھنڈی بھیگی راتیں ایک ایک آواز کو سمیٹنے کی کوشش کرتی ہیں تو جنگل بیابان، تپتی ریت، جلتی دوپہر، پانی سے لبالب کنویں پھیل جاتے ہیں اور ککوُ کوُ کا سیلاب اُمڈ آتا ہے اور ہمیں لے کر ڈوبنے لگتا ہے۔

ککوُ کوُ، دل کی دھڑکن، ہمارا پیچھا کرتی ہے۔

ہم بھاگتے ہیں

یوسف کھوہ

ہم بھاگ نہیں پاتے، زمین پاؤں پڑ جاتی ہے۔ اپنی تمام خواہشوں سمیت، تنہا، کہاں جائیں ــــــ ہم اتنے تنہا، جیسے یوسف کھوہ، ککوُ کوُ۔ تنہائی کی یہ آواز عجیب آواز ہے۔ دغا کی واردات کا اعلان، بلند آواز میں غداری کا انکشاف، صدا بہ صحرا کہ ہم میں سے کون جانتا ہے، ٹیئر گیس سے پھٹتے ہوئے پھیپھڑوں کی آواز کا ردیف قافیہ کیا ہے۔ خوف و ہراس میں بھاگتے، انسانی ستامپیڈ[1] میں کچلے ہوئے

[1] STAMPEDE

بچّوں کے آخری سانسوں، تار تار کپڑوں سے جھانکتی چھاتیوں، جبر سے سوجتی کوکھوں کا آہنگ کیا ہے۔ چارج لاٹھیوں اور سنسناتی گولیوں سے اُبھرتی چیخوں کا تعلق شعر کی کس صنف سے ہے؟ آؤ چلیں اپنے گھروں کو اور اپنے بانجھ خوابوں کی سوجی کوکھ سے تعبیروں کے جنم کی سعی کریں اور چُپ رہیں کہ آہنگ، ردیفیں، قافیے تنگ ہوگئے ہیں۔ صرف فاختہ اس تنہائی، اس عذاب، اس احساس کو لفظ دینا جانتی ہے، اعلان کی جراًت، یوسف کھوہ، یوسف کھوہ۔

یہ سڑک، جس پر ہم تنہا ہوتے ہیں، ہماری ہے۔ اوپر چاندنی سے ٹھنڈا آسمان، نیچے دھوپ سے گرم کولتار، نغمے سناتی ہوا، زمین کی باس لیے بارش، یہ سڑک جس پر ہم تنہا ہوتے ہیں، ہماری ہے۔ ہم نے اپنا دل ہار دیا۔ اپنی معصومیت، اپنے ماں باپ، بھائی بہن، عزیز رشتہ دار، اپنا گھر، اپنی جنگ، اپنا آدھا ملک ہار دیا، لیکن یہ سڑک ــــ! یہ سڑک ہماری ہے، جہاں جنگلوں، بیابانوں، جلتی دوپہروں، تپتی ریت اور پانی کے کنوؤں سے بھٹکتی بھٹکاتی ایک صدا آکر ہمارے گرد محیط ہوجاتی ہے۔ ہمارے گرد۔ ہم، کہ کٹیلے آنسوؤں، ہیروانہ انداز سے جذباتی، ایک اور والہانہ عشق سے فریب خوردہ، تنہا، معزورلئے، کھوئے ہوئے، گانو گانو، قریہ قریہ، شہر شہر بھول بھیلوں میں بھٹکائے ہوئے۔

فاختہ کی زاری، ان لیبرنتھوں میں کھوئے ہووں کی تلاش میں نکل آتی ہے تو کبھی کبھی کبھی کبھار جب مست ہاتھی کی طرح ڈولتی بس کی روشن بتیاں گئی رات کی تاریکی کو جھنجھوڑ کر پھر اسی لحاف میں اتار جاتی ہیں تو کبھی کبھی، شہر میں ایک کھڑکی کھلی رہ جاتی ہے۔ روشن روشن، شہوانی سانسوں کی طرح گرم گرم، کھلے پٹ، دعوتِ عمل دیتی مستطیل، رات کی انتہاء میں ایک کھڑکی۔ تب واقعات بڑی تیزی سے رونما ہونے لگتے ہیں جیسے یہ معمول ہو۔

صرف یہ تصویر۔ روشن، گرم شہوانی سانس، کھلے پٹ، کھڑکی کے فریم میں عورت اور سرد رات۔ یہ تصویر آنکھوں میں یوں اترتی ہے جیسے چرس کا پہلا کش، کنوارے بچے بچھڑے میں، سرعت سے، تلخ، کٹیلا، حقیقی۔ باقی سب بکواس کہ زندگی اس لمحے ایسی ہی نظر آتی ہے ــــ کھڑکی، عورت، سرد رات، ٹوٹی پھوٹی میز پر پڑے بوسیدہ، نیلے چھیلے میز پوش

پر پڑا میلا کچیلا کرنسی کا نوٹ ، روٹی کا ایک آدھ سخت بسکٹ نما ٹکڑا ۔ پنڈلیاں ، رانیں ، چھاتیاں ، لہو ۔ چرس کا کش ، آگ ، روشنی ، جیسے سورج حلق سے اُتر گیا ہے ۔ آج رات بھی کافی ہے ۔ کھڑکی ، پنڈلیاں ، رانیں ، پستان ، لہو اور یوسف کھوہ ـــــ فاختہ کی چونچ باندھ دو ، پھولوں کی خوشبو میں رچی رات کو ٹھونگے مارتی ہے ۔

وہ شخص رات کی خوشبو کا ڈسا ہوا ، سارا زہر اپنے وجود میں لیے اس کھڑکی سے ذرا ہٹ کر کھڑکی کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے باہر پھیلی ہوئی سرد رات عورت کھڑکی سے باہر جھانکتی ہے ۔ زرد چہرے ، ویران آنکھوں اور سیاہ بالوں والی عورت ۔ خوب صورت پنڈلیوں ، مرمریں رانوں والی عورت ۔ وہ شخص ، خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا سوچتا ہے ' شاید اس عورت کی ٹانگیں سوڈے کی بند بوتلیں ہوں ۔ اس عورت کا انداز بالکل ایسا ہے جیسے گئی رات میں کھڑکیوں میں کھڑی ہونے والی عورتوں کا ہوتا ہے ، بے جھجک ، ہیجان انگیز جیسے یوسف کھوہ ، یوسف کھوہ ۔

کھڑکی کے قریب کھڑا ، تنہائی کا زخم خوردہ شخص اپنے پرانے خشک جوتوں کی طرح چرمراتا ہے ۔

ـــــ نہیں ؟

ـــــ نہیں ۔ بچے ہماری آواز سن کر جاگ جائیں گے ۔ روٹی روٹی کریں گے ـــــ دوبارہ نہیں سوئیں گے ۔ ساری رات ـــــ سمجھے ـــــ ؟

ـــــ میرے پاس پکی پکائی تازہ روٹی ہے ۔

وہ اپنی بغل سے سیلوفین پیکٹ نکال کر دکھاتا ہے ۔ عورت اس پیکٹ کو غور سے دیکھتی ہے ۔ کھڑکی سے پلٹتی ہے ۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلتا ہے ۔ سرد رات اس شخص کو سرد ہاتھوں سے تاریک کنویں میں دھکیل دیتی ہے ۔ عورت دروازہ بند کرتی ہے ۔ وہ ، عورت کے پیچھے دہلیز سے ٹھوکر کھاتا ، کواڑ سے الجھتا ، چند سیکنڈ بعد ایک روشن کمرے میں داخل ہوتا ہے ، جس کی روشنی سڑک کی طرف کھلتی کھڑکی سے باہر نکلتے ہی غائب ہو جاتی ہے ۔ عورت بڑھ کر کھڑکی بند کرتی ہے ۔ پلٹ کر عجیب نگاہوں سے اس کو دیکھتی ہے ۔ اس شخص کی نگاہیں عورت کی آنکھوں کے شکنجے سے تڑپ کر نکلتی ہیں اور دیواروں پر لڑکھڑانے لگتی ہیں ۔ ننگی ، میلی ، جگہ جگہ سے اکھڑے پلستر والی دیواروں پر خانۂ کعبہ اور مسجد نبوی

کی تصویروں والے صدیوں پرانے دو کیلنڈر، قدیم کتبے اور ٹوٹے ہوئے شیشے، فریم میں جڑا بوسیدہ مخمل کا ٹکڑا، جس پر بجھتے سنہری تاروں سے "عمل سے زندگی بنتی ہے" والا شعر لکھا ہے۔ وہ ٹوٹی پھوٹی میز پر پڑے بوسیدہ میلے کچیلے میز پوش پر بچی پکائی روٹی کا پیکٹ رکھ دیتا ہے۔ عورت تیزی سے بڑھ کر پیکٹ اٹھاتی ہے اور ساتھ والے کرے کی تاریکی کچھ ایسے روشن ہوجاتی ہے جیسے یوسف کھوہ ___ اس سمے تاریکی میں اترتی عورت اور روشنی میں اترے اس شخص کو دیکھ کر کہا نہیں جاسکتا، کون روشنی میں تاریک ہوا، اور کون تاریکی میں روشن!

یوں صدیوں سے ___

○

انور سجّاد

# رات کا سفر[۱] نامہ

تخت کی چوتھی ٹانگ اینٹیں رکھ کر بنائی گئی ہے۔

یوں لگتا ہے جیسے تین ٹانگ کے تخت پر بیٹھی عورت سانس نہیں لے رہی۔ وہ باہر کی طرف کھلتی اس ٹوٹی پھوٹی کھڑکی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی ہے، جہاں کھڑے، باہر دیکھتے مرد کا سینہ کچھ یوں پھیل سکڑ، پھیل سکڑ رہا ہے جیسے روشنی، تاریکی، روشنی، تاریکی میں پھیلتی سکڑتی، پھیلتی سکڑتی آنکھوں کی پتلیاں۔

کھڑکی سے باہر شہر

شہر پر تنے گدلے آسمان کی سڑاند ساری کائنات میں پھیلی ہے۔ چاند مدقوق، کہ یقین سا ہونے لگتا ہے یہ تعفن اسی کے سانس سے ہے۔ دراصل یہ تعفّن شہر میں پھیلی بد روؤں کے جال میں پھڑ پھڑاتی، مکانوں سے رہائی کی امید میں بند کواڑوں پر دستک دیتی خواہشوں سے اٹھتا ہے۔ کاروں، بسوں، رکشوں کے ایگزاسٹ پائپوں سے نکلتا دھواں، گٹروں کے کھلے دہانوں سے اٹھتا بھوپارہ، ڈرائنگ روموں میں شوں شوں سپرے سے معلق خوشبو، تنگ و تاریک گلیوں کی سیلن، پیلے سبز گیلے پتوں، گلی سبزیوں پھلوں کی سڑاند، تازہ پھولوں کی مہک، صابن سے ناآشنا بغلوں، چڈوں، جسم کی سلوٹوں سے اُمڈتے خشک پسینے کی باس، اوڈی کلون، ایمونیا، ڈر، خوف، محبت، نفرت، وفا، بے وفائی —— شہر پر پھیلی رات کی کچی پکی بو ان ہی سے ترتیب پاتی ہے۔

---

۱ SUFFER

عورت، جو تین ٹانگوں والے تخت پر، کہ چوتھی ٹانگ جس کی اینٹوں سے بنائی گئی ہے، بیٹھی مرد کی اور ٹکٹکی لگائے دیکھتی ہے۔ اس کی آنکھیں خشک ہیں۔ پلک جھپکائے بغیر مسلسل دیکھنے کے باوجود آنکھوں میں پانی ایک قطرہ نہیں اور یوں لگتا ہے جیسے سانس نہیں لے رہی۔ اس کے دوپٹے میں اتنے چھید ہیں کہ دوپٹہ خواہشوں کا جال دکھائی دیتا ہے، جس میں لپٹی لپٹائی، پھنسی پھنسائی، مرد کے وجود کے پار، کھڑکی سے باہر اُگے مکانوں کے جنگل کو دیکھتی ہے۔ روشنی تاریکی، روشنی تاریکی میں مرد کی آنکھوں کی پتلیاں، چمگادڑوں کی طرح پھیلتی سکڑتی، پھیلتی سکڑتی ہیں۔ وہ دونوں ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کے شہر کو اس کے بسے ہوئے چاند اور متعفن رات سمیت مٹھی میں بند کر لیتا ہے۔ اس کی آواز سکوت کو آری کی طرح کاٹتی ہے۔

—— ہم شہر ہیں میری جان۔ موٹروں، سائیکلوں، رکشوں کے پھٹے پُرانے، گھسے ٹائر، سبزیوں پھلوں کے چھلکے، ردّی کاغذ، مٹی پتھر، گلیاں، بازار، شاہراہیں، گھر، گھروندے، بجلی کے کھمبے، روشنی والے، روشنی سے عاری بلب، ہم شہر ہیں۔ ضیق النفس، جلتے ہوئے، ٹھٹھرتے ہوئے ہم تنہا، یہ شہر ہیں۔ ہم شہر میں ہیں، شہر سے باہر ہیں، شہر ہمارے اندر ہے اور ہم نے پیٹ سے نہ اترے ہوئے خصیوں والے دجّالوں سمیت سب کچھ برداشت کر رکھا ہے۔ ہم تصور میں نہ آنے والی ان پرچھائیوں کو بھی برداشت کرتے ہیں جو صرف رات میں زندہ ہوتی ہیں جو موت کی تاریکی کی باہوں میں باہیں ڈالے ویران اندھیری سڑکوں پر پھرتی ہیں اور جنھیں ایک سو نویں گرفتار کرنے والے تاریک پلوں کے نیچے بیٹھے خود اپنی رانوں میں ہاتھ دیے، تار تار ریشم لباسوں اور لٹکتی ریشمی چھاتیوں کو مسلتے ہیں۔ ہم ان تاریک راتوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے پہاڑی چڑھتے ہیں، چوٹی پر پہنچ کر پتھر رات لڑھکتی ہے، ہم اس کے پیچھے بھاگتے پہاڑی سے اُترتے ہیں، پھر اس بوجھ کو اپنے کاندھوں پر لاد کے پہاڑی چڑھنے لگتے ہیں۔ اُترتے نشے ایسی رات، خون آلود دہنوں کے چھاپے خانے سے نکلتے اخبار کے کاغذوں پر پھیلی ہوئی، اعصاب پر سوار رات کو ہم برداشت کرتے ہیں اور زندہ رہ کر آج کے زمانے میں معجزے کا مظہر بن جاتے ہیں۔ محبت، راتوں میں اذیت ناک، ہم ہر اس شے سے محبت کرتے ہیں جو ہمارے پاس ہے۔ ڈر، خوف، کپکپی، یاس جس سے کوئی فرار نہیں، رات کے خلاؤں کو پُر کرتی ہے، ہمارے بستروں کے آس پاس، گیتوں میں گنج گلیوں میں، لیکن ہم ہنستے ہیں۔ ہم فریب خوردہ، تلخ علوم کے وارث اور محبتوں کے ترک کیے ہوئے، ہم ہر

رات سورج کو اُڈیکتے ہیں۔ "صبح کب ہوگی، اے میرے ـــــ" ہر جھوٹ کے ساتھ ہم سچ کے منتظر، رات میں کھائی ہوئی ہر قسم پر ایمان لاتے ہیں، ہم کہ جو موت کے منجدھار میں زندگی پہ یقین رکھتے ہیں، بن چہروں کے، بن آنکھوں کانوں ناکوں کے سیلاب میں کھڑے ہیں۔ فرار کا راستہ کوئی نہیں، ہمارے ہونٹوں سے ہنسی اُبلتی ہے۔سحر میں ہمارا ایمان ہے۔ ہمارے اعتماد کی بنیادوں میں سحر کی روشنی ہے، ہم چیختے ہیں، آنے والے کل کو پکارتے ہیں۔سناٹا۔سحر کی شناخت کیا ہے؟ وہ، وہ، وہ شہر، روشنی، تاریکی، عورتیں، بلّیاں، کتّے، رات۔ میری جاں بند کواڑ اکھاڑ پھینکو، چیخو، قسم کھاؤ، گالی دو، سسکیاں بھرو، لیکن نکلو۔ باہر نکلو اپنے آپ سے، ہر اس شئے سے جو تمہیں جلاتی ہے، اذیت دیتی ہے۔ اپنی اذیت کو چیخ کے ساتھ باندھ کر کھڑکی سے باہر پھینک دو، جواب ملے نہ ملے، شناخت ہو نہ ہو۔

کھڑکی سے باہر شہر

کھڑکی سے باہر گلیوں میں رات، اپنے دامن میں کنواری لڑکیوں، عصمت باختہ عورتوں کی مہک سمیٹے۔

شہر کی گلیوں میں یہ گھر، جس کے ایک کمرے میں، کہ جس کی دیواروں کو مکڑی کے جالوں نے ایک دوسرے سے منتھی کیا ہے۔ مرد کھڑکی سے بازو باہر نکالے، شہر، اُس کے لٹکے ہوئے چاند اور متعفن رات کو مٹھیوں میں لیے کھڑا ہے۔ وہ رات اور شہر کی بھول بھلیاں میں اسقدر کھو گیا ہے کہ اس عورت کی نظروں کے تاگے بھی اس کے لیے راستہ نہیں بنا پا رہے جو تین ٹانگوں والے تخت پر بیٹھی ٹکٹکی لگائے اس کی طرف، اس پار آنے والے موسموں اور شہر کے جنگل کو دیکھتی ہے اور جس کے گرد لپٹے دوپٹے میں اتنے چھید ہیں کہ دوپٹہ خواہشوں کا جال دکھائی دیتا ہے۔

مرد کی آواز پھر سکوت کو چھوڑتی ہے۔

ـــــ تو پھر ہم زندہ کیوں ہیں۔ نفرتوں کے حوالے سے؟ یہ نفرت ہی ہے کہ میں ہنستا ہوں، روتا ہوں، کھاتا ہوں سوتا ہوں اور پھر جاگ اُٹھتا ہوں! صرف نفرتوں کے حوالے سے ہم بستری، بچوں کی تخلیق؟ میں لڑکیوں کی رانوں میں جھوٹی محبت پھونکتا ہوں اور انھیں حقیقت کی پہچان کرنے کو چھوڑ دیتا ہوں، حقیقت، وہ بے خون، لٹکی چھاتیوں، چپٹی رانوں والی، کریہہ المنظر، بے حد استعمال شدہ فاحشہ۔

وہ عورت، جسے دیکھ کر محسوس نہیں ہوتا کہ سانس لے رہی ہے اور جو تین پایوں والے

تخت پر، کہ چوتھی ٹانگ جس کی اینٹوں سے بنائی گئی ہے، بیٹھی، ٹکر ٹکر مرد کو دیکھے جاتی ہے، اب آہستہ آہستہ اٹھتی ہے جیسے خواب میں۔ وہ دھیرے دھیرے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی مرد کی طرف بڑھتی ہے۔ چھیدوں سے بنا دوپٹہ اس کے وجود سے پھسل کر زمین پر یوں پھیل جاتا ہے جیسے خواہشوں کا جال۔ وہ مرد کے بالکل پیچھے جا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کے نازک ہونٹ ہلتے ہیں۔

—— اب کیا ہوگا ـــ ؟ کب ہوگا ؟ امکان کیا ہے ؟

مرد مٹھیاں کھول کر کھڑکی کو دونوں طرف سے ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔

—— ہوں ؟ پتا نہیں، صبح کب ہوگی ! ہم ہڈیاں چچوڑتے ہیں اور غاروں میں رہتے ہیں۔ لیکن کسی روز بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے سحر اگلے موڑ پر ہو۔ ہو سکتا ہے اس وقت کسی بستر میں سحر جنم لے رہی ہو۔ ہو سکتا ہے جنم ہو گیا ہو کہیں اور ہم جان نہ پائے ہوں، ہو سکتا ہے ہم نے سحر کو دیکھا ہو اور شناخت نہ کر پائے ہوں۔ کہیں ہم بے حس تو نہیں کہ ہم نے اپنے آپ کو قہقہوں کے حوالے کر رکھا ہے ؟ یاس، آنسوؤں اور رات کے ہراس کے حوالے کر رکھا ہے ؟ کیا ہم خود ہی تو اپنا جواب نہیں ؟ کیا ہم خود اپنے آگے جواب دہ نہیں ؟ کیا سوال کا جواب حاصل کرنا بھی تو ہمارے ہی اختیار میں نہیں کہ جواب ہمیں خود ہی دینا ہے ؟ بولو، بتاؤ، تم ہی کہو۔

وہ پلٹ کر قریب کھڑی عورت کی طرف دیکھتا ہے۔ تب اس عورت کی آنکھیں، جو پلک جھپکے بغیر مسلسل دیکھنے کے باوجود خشک تھیں، یکدم بھر آتی ہیں۔ لیکن اس کے معصوم چہرے پر کوئی تاثرات نہیں ہیں۔ مرد کے تیز تیز بھاری سانسوں میں اس کے چھوٹے چھوٹے سانس یوں گھل مل جاتے ہیں، جیسے روشنی تاریکی، روشنی تاریکی میں پھیلتی سکڑتی، پھیلتی سکڑتی، آنکھوں کی پتلیوں میں سامنے نظر آنے والی چیزیں۔ دونوں لمحہ بھر کے لیے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔

دیواروں کو آپس میں متحد کرنے والے مکڑی کے جالے، تار بہ تار روشن ہونے لگتے ہیں۔ باہر چاند، تارے، روشنی کے بلب اور بھی زرد، اور بھی پھیکے پڑ جاتے ہیں —— باہر شہر ہے، دھندلایا ہوا، تاریک تاریک، خوف زدہ کر دینے والا، تا حدِ نگاہ پھیلا ہوا، ظالم، مہربان شہر گونگا، پر وقار، نہ مرنے والا[1]

---

[1] وولف گانگ بورشرٹ

مرد، عورت کی کمر میں بازو حمائل کر کے ٹوٹی پھوٹی میز تک آتا ہے جس پر کاغذ اور قلم پڑے ہیں اور جس پر پڑے ٹیبل لیمپ کی روشنی اور بھی زرد، اور بھی پھیکی پڑ چکی ہے۔ وہ میز پر پڑی چیزوں کو دیکھتا عورت سے کہتا ہے۔

ـــــ چائے

اور میز سے کاغذ قلم اٹھا کر وہ آ کے اس تخت پر بیٹھ جاتا ہے جس کی چوتھی ٹانگ اینٹیں رکھ کر بنائی گئی ہے۔ وہ لمحہ بھر کے لیے کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے پھر سفید کاغذ پر قلم کی روشنائی سے رات کا سفرنامہ لکھنے لگتا ہے۔

باہر آنے والے موسموں کے کھیتوں سے اُگتے، لہراتے، کڑکتے طوفانوں کے دوش پر سوار آئی سحر، شہر کے بند دروازوں پر دستک دیتی ہے۔

○

انور سجّاد

# رات کا پچھلا پہر

ایک ٹیلی ویژن کھیل

یہ کھیل پہلی مرتبہ لاہور ٹیلی ویژن سے جشنِ تمثیل میں ۲۸ اگست ۷۵ء کو مندرجہ ذیل کاسٹ کے ساتھ پیش کیا گیا۔

| | | |
|---|---|---|
| ناصر | : | شجاعت ہاشمی |
| بشیر | : | دلدار پرویز بھٹی |
| اجنبی | : | انور سجاد |
| پہرے دار | : | ظلِ سبحان |
| ماں | : | عطیہ شرف |
| فرمان | : | شاہ عنایت |
| شہلا | : | روبینہ اکاش |
| رضیہ | : | دینا |

اور بہت سارے مرد، عورتیں، ایک بچہ

ھدایت : یاور حیات

نیڈ ان

رات کا پچھلا پہر،
شہر کی عظیم الشان مارکیٹ۔ تمام دکانیں بند ہیں۔ چند، نی اون سائین جگنو بنے ہیں۔ سڑک کے کھمبوں پر اور کچھ دکانوں سے باہر بلب روشن ہیں۔ سڑک پر دو ایک کتوں کے سوا اور کوئی ذی روح نہیں۔ چند سیکنڈ بعد دور سے پہرے دار کی سیٹی کی آواز آتی ہے، جس کے ختم ہوتے ہی، دور ہی سے پہرے دار کی آواز آتی ہے۔

پہرے دار: (آواز) جاگتے رہنا، بھئی اوووو ـــ

چوکیدار کی آواز معدوم ہوتے ہی مکمل سناٹا، چند سیکنڈ۔ اس سناٹے میں فلیٹھ ڈپو کی دیوار پر ایک میلا کچیلا ہاتھ رینگتا ہے اور ساتھ ہی کتے کی انتہائی غیر کتیانہ بھونکار سنائی دیتی ہے۔

چلتے ہوئے دو گھوڑوں کے سموں کے ساتھ ہی سموں کی کان پھاڑ دینے والی آواز ایک پلا چیاؤں، چیاؤں کرتا، سموں سے اُلجھ کر بھاگتا ہے۔ ان گھوڑوں پر رات کی گشت کے سپاہی سوار ہیں۔ ایک بہت بڑی، میلی کچیلی آنکھ، گھوڑوں کو دور تاریکی میں غائب ہوتا دیکھتی ہے۔

آنکھ پر فلیتھ ڈپو اُبھرتا ہے، جس پر جلی حروف میں لکھا ہے "کوڑا کرکٹ"۔ کوڑا کرکٹ فلیتھ ڈپو کے کناروں سے جیسے اُبل ابل کر باہر پھیل گیا ہے۔ آنکھ معدوم ہو جاتی ہے۔ فلیتھ ڈپو کے سامنے دو پیر، لیٹے ہوئے شخص کے پھٹتے ہیں۔ ساتھ ہی وہی غیر کتیانہ بھونکار، اب قریب سے اور لمبی ـــ اسی دم، تاریکی میں کار کی دو بتیاں اُبھرتی ہیں۔ فلیتھ ڈپو سے ذرا دور، بائیں جانب مڑتی گلی کے نکڑ پر آ کے کار رکتی ہے۔ بتیاں بجھ جاتی ہیں۔

کار میں بشیر اسٹیرنگ کے پیچھے بیٹھا ہے۔ ناصر اس کے ساتھ والی سیٹ پر۔

فلتھ ڈپو کے قریب والا "کتا" پھر بھونکتا ہے۔ کار میں دونوں چونک جاتے ہیں۔ بھونکار ختم ہونے پر اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔ بشیر انتہائی بوکھلایا ہوا ہے، ناصر اتنا ہی پُراعتماد۔ ناصر، ماتھے پر پسینہ آئے بشیر کو اشارہ کرتا ہے کہ پچھلی سیٹ پر پڑا سامان اُٹھالے اور خود اپنے جوتے اتارنے لگتا ہے۔ بشیر کار سے اترتا ہے۔ کار ٹیکسی ہے۔ بشیر ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر سامان اُٹھانے لگتا ہے۔ ایک بہت بڑا تھیلا، جس میں اوزار ہیں ایک چھوٹی سی ٹرالی مارکہ ریڑھی۔ اس سے یہ دونوں چیزیں یکدم نہیں اُٹھائی جاتیں۔ بےبسی میں ٹرالی رکھ کر صرف تھیلا اُٹھا لیتا ہے۔ ناصر جوتے اتار کے ٹیکسی سے اترتا ہے۔ بہت احتیاط سے دروازہ بند کرتا ہے۔ اسی دم بشیر کے کندھے سے بھاری تھیلا پھسل کر گرنے لگتا ہے۔ ناصر فوراً بڑھ کر تھیلے تھامتا ہے۔ بشیر کو قہر آلود نظروں سے دیکھتا ہے۔ تھیلے سے چند اوزار نکال کے خود تھام لیتا ہے۔ قریب سے پھر وہی لمبی غیر کتیانہ بھونکار۔ دونوں چونک کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں۔ کچھ نظر نہیں آتا۔

لمحہ بھر کے لیے پھر وہی میلی کچیلی آنکھ اُبھرتی ہے۔ لیکن اب پتا نہیں چلتا کہ یہ آنکھ انسان کی ہے یا کتے کی۔

ناصر دفعہ، تاریک گلی میں دیکھتا ہے۔ گلی میں اپنے کسی کھمبے کی روشنی نہیں۔ ساتھ والی کوٹھی میں جتنی روشنی درختوں کے پتّوں سے چھن چھن کر آرہی ہے۔ ناصر بشیر کو چلنے کا اشارہ کرتا ہے۔ بشیر کے چہرے پر بےزاری اور مرضی کے خلاف کام کرنے کے تاثرات ہیں۔

ناصر، گلی میں آگے بڑھ رہا ہے، بہت احتیاط سے، اس کی آنکھیں مستقبل میں اتری ہیں۔ بشیر چند قدم تیزی سے چل کر اس کے ساتھ آملتا ہے بشیر ماحول کا جائزہ لیتا اوپر کو دیکھتا ہے۔ دکانوں کے اوپر بنے فلیٹوں کی کھڑکیاں بند ہیں۔ ایک دو کھلی کھڑکیوں سے روشنی آرہی ہے۔ باتیں سرگوشیوں، دھیمے لہجوں میں ہوتی ہیں۔

بشیر: (تشویش سے) مارکیٹ تو دوسری طرف ہے۔
ناصر: دکانوں کے پچھلے دروازے اسی گلی میں کھلتے ہیں۔
بشیر: (سادہ لوح) کیوں ــــ؟
ناصر: (غصّہ پیتے ہوئے) سامان وغیرہ ان ہی دروازوں سے لایا جاتا ہے۔
بشیر: اور ــــ اور وہ جنرل سٹور کا دروازہ؟
ناصر: (اور بھی ضبط کرتے ہوئے) میں تم سے زیادہ بے صبر ہوں۔

ناصر ایک دروازے کے سامنے رک جاتا ہے۔ اس دروازے کے ساتھ تقریباً دو دو فٹ کے فاصلے پر بالکل اسی قسم کے دو اور دروازے ہیں۔ یہ تینوں دروازے ایک دوسرے کی کاربن کاپی معلوم ہوتے ہیں۔ ناصر کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔ بشیر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے۔

ناصر: (دروازوں کی طرف اشارہ) ان میں سے ایک کے پیچھے ہمارا مستقبل قید ہے۔
چوکیدار: (دور ــ آواز) جاگتے رہنا بھئی اوووو ــ
بشیر: تمہیں ــ تمہیں کیسے پتا ہے، کس دروازے کے پیچھے ــــ
ناصر: (ہاتھ میں پکڑے اوزار دیکھتا، پُراعتماد مسکراہٹ سے دروازے کی طرف بڑھتا ہے) کبوتر کو کیسے پتا چلتا ہے کہ اس کی چھتری کون سی ہے ــ؟
بشیر: (دروازے کے قریب تھیلا زمین پر رکھتے ہوئے) تو پھر جلدی کرو ــــ میرے بھائی کی ٹیکسی ــــ
ناصر: (دروازے کا معاینہ کرتے ہوئے) جلدی ــ جلدی ــ جلدی

بشیر: (کراہتا زمین پر بیٹھتا ہے) کمر ٹوٹ گئی ___ دماغ چکرا گیا میرا تو ___

ناصر: (ایک اوزار چُن کر باقی زمین پر رکھ دیتا ہے۔ دروازے پر کام شروع کر دیتا ہے) زندگی کا بوجھ، جو تم صدیوں سے کمر پر اُٹھائے پھرتے ہو، اس سے کمر نہیں ٹوٹی۔؟

بشیر: (ناصر کی بات سمجھ میں نہیں آتی) کم بخت جان، بجلی والے نے تھیلے میں اتنا سامان بھر دیا۔

ناصر: (دروازے سے مصروف) کمر وہ ٹوٹتی ہے جس پر خواہشوں کا بوجھ ہو۔ دماغ وہ چکراتا ہے جس میں آئیڈیے ہوں۔ یہ دونوں عذاب میرے ہیں، تمھارے نہیں۔ (دروازے کو بے ساختہ چومتا ہے۔ پھر کھولنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے) ابھی چند لمحوں میں میری کمر سے خواہشوں کا بوجھ اتر جائے گا، جب میرے آئیڈیے کینوس پر منتقل ہوں گے۔ لفظوں کی صورت کاغذ پر اتریں گے۔ میں کارخانے میں جوتوں کے ڈیزائن بنا بنا تنگ آگیا ہوں۔ میں ___ میں ___ میں ایک ناول۔ لیکن وقت۔ پیسہ۔

بشیر: (اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے) جلدی کرو ___ میرے بھائی کو پتا چل گیا کہ میں اس کی ٹیکسی چرا لایا ہوں تو ___

ناصر: اور اس دروازے کے پیچھے وقت اور پیسا دونوں ہیں۔

بشیر: ناصر میرے بھائی کی ___

ناصر: (جھنجھلا کر) ___ ایسی کی تیسی ___ بھول جاؤ بھائی کو ___ بھول جاؤ ٹیکسی کو ___ بھول جاؤ امیر رشتہ داروں کو، منافق مسکراہٹوں والے مالکوں کو، بدصورت پہرے داروں کو ___ سوچو ___ سوچو بشیر، ہمارے خوابوں کی تعبیر اس دروازے کے پیچھے ہے۔ جب جب تم فیکٹری میں جوتوں پر ایڑیاں جوڑ رہے ہوتے ہو تو کیا سوچتے ہو۔

بشیر: (رفتہ رفتہ، خوابی کیفیت) نرم بستر، پیٹ بھر کے کھانا، خوبصورت گھر، خوبصورت لڑکیاں! خوب صورت زندگی، خوبصورت بڑھاپا ___

ناصر: (بات کاٹتے ہوئے) ___ خوب صورت موت ___ سرمایہ موت کو بھی خوب صورت بنا دیتا ہے۔

بشیر: (اسی رَو میں) میں ___ میں اپنی ایک ٹیکسی بناؤں گا۔ پھر خوب صورت لڑکی، خوب صورت بچے ___

ناصر: (اپنی دھن میں) بچے، بوریت، بیماری، پاپولیشن پلاننگ، مہنگائی، مصیبت، فکر، فاقہ، فیکٹری، فرمان، فرمان، فرمان، فرمان ___

آخری لفظوں میں جیسے وقت ٹھہر جاتا ہے۔ ناصر کے چہرے کے تاثرات جامد ہو جاتے ہیں اور لمحہ بھر کے لیے جوتے کی فیکٹری کی آوازیں اور لیپ ہوتی ہیں۔

جوتوں کی فیکٹری۔ فیکٹری کی آوازیں اس وقت تک جاری رہتی ہیں جب تک فرمان بولنا شروع نہیں کرتا۔ فیکٹری میں بہت سے لوگ کام کر رہے ہیں۔ فیکٹری کا معیار، جوتوں کے مشینی کارخانوں سے کم کم ہے۔

ناصر، ڈرائنگ بورڈ پر ایک خوب صورت لڑکی کی تصویر بنا رہا ہے۔ بشیر جوتوں پر ایڑیاں چسپاں کر رہا ہے۔ فیکٹری کا مالک، فرمان جیسے کارندوں کا معاینہ کرتا بشیر تک پہنچتا ہے۔ فرمان، سریش کے ڈبے میں انگلی ڈبو کر آنکھوں کے سامنے لاکے، اس کے گاڑھے پن کو دیکھتا ہے۔ منہ بناتا ہے، سامنے دیکھتا ہے۔ ناصر پر نظر پڑتی ہے۔ ناصر کی طرف جاتا ہے۔ ناصر فوراً بورڈ سے لڑکی کی تصویر ہٹا کر، جوتوں کا ڈیزاین سامنے لاتا ہے۔ فرمان کے قریب آنے پر بوکھلا کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ فرمان کا مکالمہ شروع ہوتے ہی باقی تمام آوازیں معدوم ہو جاتی ہیں اور کام کرنے والے جیسے روبو، بشیر، فرمان کو ناصر کے پاس دیکھ کر ان کے قریب آ جاتے ہیں۔

فرمان: ہاں — میں فرمان — (بشیر کی طرف نظریں اُٹھتی ہیں) تم سریش بناتے ہو؟ جو کاغذ کو کاغذ سے نہیں جوڑ سکتی —؟ خناس دماغ سے نکال دو مسٹر — کام کی طرف دھیان دو۔ (کائیاں نظروں سے ناصر کو دیکھتا لڑکی والی تصویر اُٹھا کے سامنے لاتا ہے) یہ ڈیزاین ہے —؟ جوتے کا؟ میرے جوتے چہروں سے زیادہ خوب صورت ہوتے ہیں مسٹر — مجھے آرٹ نہیں چاہیے، ڈیزاین چاہیے — کچھ بننا ہے تو کچھ کرو — میں خود — یعنی بذاتِ خود شروع شروع میں فٹ پاتھ پر جوتے پالش کرتا تھا۔ اب میں ماشا اللہ جوتوں کی فیکٹری کا مالک ہوں، جس کے ملازم ہر وقت ہڑتال کا نوٹس دینے پر تلے رہتے ہیں۔ ماشا اللہ میں ایک بدصورت لڑکی کا باپ ہوں،

جس کی شادی ایک احمق امیر زادے سے کرکے سرخرو ہوا ہوں اور میرے معدے میں السر ہے ۔ یہ سب کامیاب زندگی کی نشانیاں ہیں ـــ سمجھے ـــ ؟ مجھے پتا ہے تم مجھے پیٹھ پیچھے کمینہ کہتے ہو ـــ کمینے تو تم ہو جو گھر میں الّم غلّم کتابیں پڑھتے رہتے ہو ـــ جوتوں کے نئے ڈیزاین سوچنے کی بجائے آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے رہتے ہو ۔ بکو نہیں ـــ تمھاری ماں نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ تم گھٹیا عاشقوں کی طرح آہیں بھرتے ہو اور شادی سے انکار کرتے ہو ـــ کام کرو مسٹر کام ۔ اگر تم یونین کے ممبر نہ ہوتے تو میں تمھیں کھڑے کھڑے نکال دیتا (لڑکی والی تصویر پھاڑنے لگتا ہے) زندگی میں کچھ کرنا ہے تو اچھی سریشں بناؤ، اچھے ڈیزاین بناؤ ـــ مجھے تم لوگوں سے بہت ہمدردی ہے ۔ بس یونین والوں سے کہہ دو، مجھے کمینہ نہ کہیں ۔

دروازے سے باہر، ٹھہرتے وقت میں ناصر کا جامد چہرہ ، وقت کی دنیا میں واپس آتا ہے ۔ ایکشن وہیں سے تسلسل اختیار کرتا ہے جہاں رُکا تھا ۔

ناصر: (اسی طرح دروازے سے معروف زیرِ لب، مُسکراتے ہوئے) کمینہ (بشیر سے) اب ہم فیکٹری نہیں جائیں گے ۔

بشیر (متفکّر) اس مہینے کی تنخواہ ـــ ؟ (ناصر دھیان نہیں دیتا) اس سیف کی رقم کی رقم ساری عمر کے لیے کافی ہوگی ؟

ناصر: ہاں ـــ میں بچپن سے دیکھ رہا ہوں بشیر ۔ وہ موٹے موٹے شیشوں کی عینک والا موٹا گنجا ، کھلونوں سے لے کر سمگل کیے ہوئے ریشم تک سب کچھ بیچتا ہے ، چینی سے لے کر انڈوں تک ہر چیز کی بلیک کرتا ہے ۔ اس دولت کو بنیک میں جمع نہیں کراتا ۔ اس سیف میں رکھتا ہے ۔

بشیر کیوں ـــ ؟

ناصر: انکم ٹیکس والے پکڑ نہ لیں گے ، احمق ـــ ؟!

بشیر: تمھیں کیسے پتا ہے — ؟ یہ سب — ؟

ناصر: میں بچپن سے آج تک اپنی تمام خواہشیں کمر پر لاد کر یہاں لایا ہوں اور دماغ میں عذاب سیٹ کر چلا جاتا رہا ہوں — لیکن اب —

بشیر: (یکدم) دروازہ نہیں کھلا ناصر — ؟ یار جلدی کرو — میرا بھائی جاگ گیا تو —

فلتھ ڈپو کے پاس جیسے ان میلے کچیلے پیروں پر کوئی کھڑا ہوتا ہے چند قدم آگے بڑھتا ہے۔ ساتھ، وہی غیر کتیانہ بھونکار۔

پہرے دار: (دور — آواز) جاگتے رہنا بھئی اووووو

بشیر: (چونک کر آواز کی اور دیکھتا ہے۔ جملہ مکمل نہیں کر پاتا۔ بوکھلا کر کھڑا ہو جاتا ہے) میں جا رہا ہوں۔

ناصر: (اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے) نہیں بس کھل گیا دروازہ —

بشیر: تم پیشہ ور چور نہیں ہو — پکڑے جائیں گے — اتنی دیر —

ناصر: بس ایک منٹ — (دروازے پر کام کرنے لگتا ہے)

بشیر: پیشہ ور چور تو اتنی دیر میں —

ناصر: باتیں نہ کرو — کام کرنے دو — بیٹھو —

بشیر: باتیں تو تم کر رہے ہو (بیٹھ جاتا ہے۔ اسی اور دیکھنے لگتا ہے جدھر سے پہرے دار کی آواز آتی ہے)

پہرے دار: (دور — آواز) جاگتے رہنا بھئی اوووووو —

بشیر: اگر ہم نے کہہ بھی دیا کہ ہم بجلی کے محکمے سے آئے ہیں تو پہرے دار مان جائے گا؟

ناصر: ہمارے پاس سارا سامان ہے ربڑ کے دستانے بھی ہیں۔

بشیر: (تھیلے سے ربڑ کے دستانے نکال کر دیکھتا ہے، جیسے مطمئن سا ہو جاتا ہے۔ ناصر سے التجا۔) تم سے دروازہ نہیں کھلے گا ناصر — گھر چلو — ابھی میرا بھائی سو رہا ہوگا۔

ناصر اس جملے کے دوران اٹھ کر دروازے کو پوری قوت سے اندر کی طرف دباتا ہے۔ بہت احتیاط سے کہ آواز نہ ہو۔ دروازہ آہستہ سے

کھلتا ہے۔

ناصر: (جیسے ہیجان میں گھٹی سی آواز) بشیر۔ (ساتھ ہی جیب سے چاقو نکال کر کھولتا ہے)

بشیر: (یکدم اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ دروازے کو دیکھتے چاقو پر نظر پڑتی ہے) یہ۔یہ تم۔

ناصر: (دروازے سے داخل ہوتے ہوئے) شی ۔۔۔

بشیر: ٹرالی لے آؤں ۔۔۔ ؟

پہلے کمرے میں

ناصر اسے جواب دیے بغیر کمرے میں داخل ہو چکا ہے۔ کمرے میں کھلونے ہی کھلونے ہیں۔ ناصر کی بے چین نظریں نیم تاریک کمرے میں گھومتی ہیں۔ وہ اتنے ڈھیر سارے کھلونوں میں کھو سا جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے جیسے غیر شعوری طور پر چاقو بند کر کے جیب میں رکھ لیتا ہے۔ اس کے چہرے پر حسرت و یاس کے تاثرات چھا جاتے ہیں۔ کھلونے، جیسے اس کی نظروں میں، کوک بھری، مختلف حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ ان کی مشینی آوازوں پر حاوی گڑیا کی آواز ہے جو مسلسل، مشینی انداز میں "امّی۔ امّی" کہے جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ سارا کمرہ روشن ہو جاتا ہے۔ ناصر اب پسینے میں شرابور ہے۔ اسے شوکیس سے باہر ایک آٹھ نو سال کا بچہ شوکیس سے ناک چپکائے حسرت بھری نظروں سے کھلونوں کو دیکھتا نظر آتا ہے۔ چند سیکنڈ بعد ایک کمینی سی آواز اس پر اوور لیپ ہوتی ہے۔

دکان کا مالک: (آواز) بھاگ جاؤ ۔۔۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے ۔۔۔ چوری کرو گے کھلونے ۔۔۔ ؟ ابھی پولیس میں دے دوں گا ۔۔۔ کیا نام ہے تمھارا ۔۔۔ ؟ ہوں ۔۔۔ ناصر ۔۔۔ ! (بچّہ سہم جاتا ہے) تو کھیلے گا ان کھلونوں سے ؟ بھاگ جا ۔۔۔ یہ تیرے لیے نہیں ہیں۔ نہیں ہیں۔

دکان کے مالک کی آواز صورِ اسرافیل بن کر چھا جاتی ہے۔ عین عروج پر

ایک زنّاٹے کا تھپڑ جیسے اس بچے کو رسید کرتا ہے۔

ناصر:۔ (چیخ کر) تمھارے لیے نہیں ہے۔

ناصر نے اپنی دانست میں تھپّڑ بچے کو مارا ہے لیکن ایک بہت بڑے گڈے کا سر، فرش پر لڑھکتا دیکھتے ہیں۔ جس پر گڑیا کی مشینی آواز "امّی۔ امّی" اوور لیپ ہوتی ہے۔ سر لڑھکتا ہوا بشیر کے پیروں میں جا کے رک جاتا ہے۔ بشیر جو اندر آچکا ہے۔

بشیر: (پیروں میں پڑے گڈے کے سر پر آواز اوور لیپ) ناصر۔ (جیسے یہ ناصر کا سر ہو) کیا ہوا ناصر ـــ؟

ناصر: (پلٹتا ہے۔ چہرے پر آئے ہوئے پسینے کو بازو سے پونچھتا ہے) کچھ نہیں ـــ (باہر کو چل دیتا ہے، پیچھے بشیر ہے)

دروازے سے باہر۔ ناصر جھک کر اوزار اٹھاتا ہے۔ بشیر بھی باہر آچکا ہے۔

بشیر: (تھیلا اٹھاتے ہوئے) سیف ـــ ناصر ـــ سیف ـــ ؟

ناصر پہلے دروازے سے باہر پڑا سامان اٹھا کر دوسرے دروازے کو جاتا ہے۔ بشیر تھیلا اٹھائے اس کے پیچھے جاتا ہے۔

بشیر: (روہانسا) خزانہ کسی دروازے کے پیچھے نہیں ہے ناصر ـــ آؤ چلیں واپس ـــ (مڑنے لگتا ہے)

ناصر: (بشیر کو بازو سے تھامتے ہوئے) تم میرے خواب، میرے پلان، میرے مستقبل کا حصّہ ہو۔ میں تمھیں نہیں جانے دوں گا۔ (التجا سی) اس۔ اس دروازے کے پیچھے یقیناً ـــ

بشیر: تمھیں کیسے یقین ہے ۔ ؟

پھر وہی پیر نظر آتے ہیں ۔ اجنبی کے میلے کچیلے ، بڑھے ہوئے ناخنوں کے پیر
جن پر اجنبی کا ہلکا سا قہقہہ اوور لیپ ہوتا ہے ۔ اجنبی کے مکالمے کے
دوران ، ہم پیروں سے آہستہ آہستہ اس کے چہرے تک جاتے ہیں ۔
اس کا لباس بے حد پھٹا پرانا ، سر کے بال اُلجھے ہوئے ، داڑھی بے طرح
بڑھی ہوئی ۔ آنکھیں میلی ، لیکن عجیب سی چمک ۔ اُس کے گلے سے ایک
پھٹا پرانا ، پلاسٹک میں ملفوف ایک کاغذ لٹکا ہے ۔

اجنبی: ( بشیر سے ) یہ نوجوان ٹھیک کہتا ہے ۔ اس تنگ و تاریک گلی سے باہر ایک اور
تنگ اور تاریک گلی ہے ، اس سے باہر ایک اور ــــ پھر ایک اور ــــ ایک اور ــــ ( ناصر
اور بشیر دم بہ خود ہو جاتے ہیں ) سب گلیاں ایک جیسی ہیں ، پھر بھی ایک جیسی نہیں ۔
ایک آنکھ زمین پر پیسا تلاش کرتی ہے تو دوسری آنکھ آسمان پر روٹی ۔ اسی لیے لوگ
ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں ــــ ان دروازوں کے پیچھے روشنی ہے ، جب یہ
روشنی آزاد ہوئی تو کوئی کسی سے نہیں ٹکرائے گا ۔

بشیر: ( یکدم اجنبی کے پیروں میں گر جاتا ہے ۔ روہانسا ) میں ۔ میں نہیں بابا جی ــــ یہ ــــ یہ
مجھے ورغلا کر لایا ہے ۔ خدا کی قسم میں نہیں ــــ

اجنبی: ( جُھک کر اسے اُٹھاتے ہوئے ) حوصلہ ــــ جوان ــــ حوصلہ ۔ ( اجنبی کی نظر ناصر کی
طرف اٹھتی ہے جو چاقو کھول چکا ہے )

ناصر: کون ہو تم ــ ؟

اجنبی: ( لاپروائی سے ) میں ــــ ؟

بشیر: ( ناصر کو چاقو لے کر اجنبی کی طرف بڑھتا دیکھ کر ) نہ ــ نہ ناصر ۔ ( اس کا چاقو والا
ہاتھ پکڑ لیتا ہے ) قتل کا کیس بھی کراؤ گے ؟

ناصر: ( اجنبی کو گھورتا ہوا ، اسی انداز میں ) کون ہو تم ــــ ؟ ( اجنبی مسکراتا ہوا بھونکتا
ہے ــــ وہی غیر کتیانہ بھونکار )

بشیر: ( جلدی سے ربڑ کے دستانے اُٹھا کر ، اجنبی سے ) بابا جی ــ ہم ۔ ہم الیکٹریشن ہیں ۔

اس علاقے کی بجلی ــــ

ناصر: (اجنبی سے) تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا ۔

اجنبی: (ہنستے ہوئے) ہٹ جاؤ درمیان سے ــ دھوپ آنے دو ــ روشنی ــ میرے اور سورج کے درمیان ڈپو راشن کا تھا ــ فلتھ ڈپو ــ

بشیر: (ناصر سے التجا) یہ سڑی ہے ــ سودائی ہے ناصر ــ آؤ چلیں ــ

ناصر: (جو اس دوران بڑے غور سے، اجنبی کے گلے سے لٹکتے، پلاسٹک میں ملفوف کاغذ کو غور سے پڑھتا رہا ہے، کئی حروف مٹے ہیں) یونیورسٹی آف ــــ ؟ حرف مٹا ہوا ہے سَن انیس سو ــــ ؟ آگے بھی مٹا ہوا ہے ــ نام ــ ؟ اللہ ــــ آگے نام بھی نظر نہیں آتا ــ ڈگری ــ ؟ اِن ــ اِن ــ فلاسفی ــ ! (ہنستا ہے) فلتھ ڈپو فلاسفر ــــ ؟ جاؤ ــ راستہ ناپو ــــ (اجنبی نفی میں سر ہلاتا ہے ۔ ناصر جیب سے سکہ نکال کر اسے دیتا ہے ۔ اجنبی ہنستا ہے ۔ سکہ نہیں لیتا) تو کیا مانگتے ہو۔؟

اجنبی: تخت نہیں مانگتا، تاج نہیں مانگتا، بھیک نہیں مانگتا۔ حصہ مانگتا ہوں، حق مانگتا ہوں ــــ اپنے کام کا معاوضہ ــــ

ناصر: (حیرت سے) معاوضہ ــــ ؟

اجنبی: ہاں ــــ جب سے تم نے اپنا کام شروع کیا ہے، میں مناسب وقفوں کے بعد بھونکتا رہا ہوں اور جب تک تمھارا کام مکمل نہیں ہو جاتا، بھونکتا رہوں گا۔ گلی میں کتا بھونکتا رہے تو لوگ مطمئن رہتے ہیں ۔

بشیر: (ناصر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے) آؤ ناصر ــ (اجنبی سے) ہم جا رہے ہیں بابا جی ــــ

ناصر: (جو اجنبی کو بے حد غور سے دیکھتا رہا ہے) پانچ فی صد ــ ؟

اجنبی: صدیوں کا چکر ــــ ؟ کو اپریٹ کرو یار ــــ اس کو اپریٹیو معاشرے میں ــ (اس دوران بشیر ناصر کے کان میں کھسر پھسر کرتا ہے) چوری کرو جوان، سازش نہ کرو ــــ میں سب جانتا ہوں تمھارے بارے میں ــــ

بشیر: (تیزی سے) تم کیا جانتے ہو ــ ؟

اجنبی: تمھاری خواہشیں، تمھارے خواب ــــ

ناصر: تم واقعی پڑھے لکھے ہو ــ ؟!

اجنبی: وہ کیا ہوتا ہے — ؟ لفظ چاٹ کر جگالی کرنا، پھر اُگل دینا — ؟
ناصر: جلدی بولو — میرے پاس وقت نہیں۔ دس فی صد — اس سے زیادہ ایک پیسہ نہیں۔
اجنبی: (ہنستا ہے) تم صدیوں پر لفند ہو تو چلو ٹھیک ہے — اب تم چوری کرو جوان، باتیں کم کرو — میں اپنا کام کرتا ہوں۔ (وہی بھونکار — ناصر چاقو جیب میں رکھ کر دوسرے دروازے کی طرف پلٹتا ہے)
بشیر: (بے بسی سے) ناصر —
اجنبی: (بشیر کو ہاتھ سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے) بیٹھو یار —
بشیر: (بیٹھتے ہوئے ناصر سے) یہ دروازہ نہیں کھلے گا ناصر — گھر چلتے ہیں — میرا بھائی ابھی سو رہا ہوگا — چپکے سے جاکر اس کی گاڑی گراج میں رکھ دیں گے اور جان بجلی والے کے گھر چلیں گے۔ وہاں ابھی تاش چل رہی ہوگی۔ فلموں کی باتیں اور —
اجنبی: باتوں باتوں میں فلم ایکٹرسوں سے فلرٹ کروگے — ؟ (ناصر کی طرف اشارہ) اور یہ — یہ کہ اس نے آج تک ایک پینٹنگ نہیں بنائی۔ اپنی کتاب کا ایک حرف نہیں لکھا — ؟ کہ راستے میں پتھر ہی پتھر ہیں — ؟ فاقے کا پتھر، بیماری کا پتھر، رشتے کا پتھر، خون کا پتھر، ماں کا پتھر، ماں — ماں (بشیر کا منہ حیرت سے کھلا رہ جاتا ہے۔ اجنبی کے آخری جملے دروازے پر کام کرتے ناصر پر اوور لیپ ہوتے ہیں)
ناصر: (کام کرتے ہوئے۔ اجنبی کے لفظ دہراتا ہے) ماں کا پتھر، ماں، ماں، ماں،

وقت ٹھہر جاتا ہے۔ ناصر کے تاثرات جامد ہو جاتے ہیں۔
ماں کا چہرہ، جس پر ناصر کی آواز "ماں۔ ماں" اوور لیپ ہوتے ہیں۔
نچلے متوسط گھرانے کا باورچی خانہ، جو بیٹھک کا کام بھی دیتا ہے۔ تخت، ایک دو موڑھے۔ ماں باورچی خانے کے کھُرے میں برتن مانجھ رہی ہے۔ ناصر دروازے سے داخل ہوتا ہے، سوچ میں گم، باروچی خانے میں بڑھتا ہے۔

ماں: (اسے وہیں روکتے ہوئے) نہ نہ نہ جوتے اتار کے آؤ — میں نے ابھی تپڑی ماری ہے (ہاتھ دھو کر اٹھتی ہے۔ ناصر لمحہ بھر کے لیے ماں کو دیکھتا ہے پھر جوتے اتار کے

اندر آتا ہے۔ ماں سے پرے رک جاتا ہے۔ ماں کو تکتا رہتا ہے) بھوک لگی ہوگی تمھیں — (نعمت خانے تک جانے، کھانا نکال کر تخت پر رکھنے کے عمل کے دوران بولتی رہتی ہے) ابھی دیتی ہوں کھانا — ہاں ہاں — تو اور کیا — ؟ وہی دال روٹی — روٹی میں سے آٹا غائب اور دال سے — ٹھیک ہے، تمھیں ماں سے لڑنے کا حق پہنچتا ہے — جنا جو ہے میں نے — (ناصر تخت سے اٹھتا ہے، دروازے کی طرف چل دیتا ہے) کبھی دو منٹ ماں کے پاس بھی بیٹھ جایا کرو — ماں کی بھی سن لیا کرو (ناصر رک جاتا ہے) رضیہ آئی تھی — (ماں اس کی طرف لمحہ بھر کے لیے دیکھتی ہے ردِّ عمل کے لیے، ناصر کا چہرہ بالکل سپاٹ ہے) نہیں۔ رضیہ کی ماں آئی تھی — کہتی ہے — شادی کی تاریخ کب تک پیچھے ڈالتے رہو گے — ؟ (ناصر پھر دروازے کی طرف چلنے لگتا ہے) کھانا تو کھا لو — بھاگا نہیں جا رہا کہیں بشیر — کمال ہے تمھیں کھانے سے دلچسپی نہیں ؟ تمھیں ماں سے دلچسپی نہیں، روٹی سے دلچسپی نہیں — تمھاری عقل پر پتھر تو نہیں پڑ گئے — ؟ ہیں — ؟ چلا گیا — ؟

دروازے سے باہر

ناصر کے جامد چہرے پر وقت کا ٹھہراؤ بہنے لگتا ہے۔

ناصر: (اسی طرح دروازے پر کام کرتے ہوئے) چلا گیا — کہ اب راستے کے پتھروں کو ہٹا کے واپس آئے گا۔

بشیر: کیا — ؟ (اجنبی بھونکتا ہے)

(بشیر کو ایک نظر دیکھ کر) مائیں بھی عجیب چیز ہوتی ہیں۔ (ریتی کو دیکھتے ہوئے)

ناصر: یار یہ کیا مصیبت ہے۔ ریتی بالکل کند ہے، اور برما بالکل بکواس — جان بجلی والے کی دکان زیادہ دیر نہیں چلے گی۔ (پھر کام میں معروف ہو جاتا ہے)

بشیر: مائیں اتنی عجیب کیوں ہوتی ہیں — ؟

اجنبی: امیدوں کے بر آنے کا سانس لینے کی آرزو میں تڑپتی رہتی ہیں۔ مرتی نہیں۔ اس لیے عجیب لگتی ہیں، مائیں۔

بشیر: (اجنبی سے) تم نے بتایا نہیں تم کون ہو — ؟ (اجنبی ہنس دیتا ہے) اور — اور تمھیں یہ سب کچھ، ہمارے بارے میں کیسے پتا ہے — ؟

اجنبی: میں، تم میں سے وہ ہوں جسے فلتھ ڈپو پر پھینک دیا گیا ہے۔

بشیر: (احمقانہ حیرت) تم، ہم میں سے ہو ــــ؟

اجنبی: ہاں ــــ اور تم جانتے نہیں ہو ــــ

بشیر: کمال ہے ــــ! ناصر ــــ یہ کیا بکواس کر رہا ہے (ناصر دھیان نہیں دیتا)

اجنبی: (بشیر کے سر کو اُنگلی سے بجاتے ہوئے) یہاں ایک بھولے بسرے کونے میں فلتھ ڈپو ہے ــــ ہاں ــــ میں یہاں لاکر پھینکا گیا ہوں، یہیں رہتا ہوں۔

بشیر: (ہنستا ہے) پاگل ــــ تمھاری بکواس میری سمجھ میں نہیں آتی ــــ میں جارہا ہوں ــــ میرے بھائی کی ٹیکسی ــــ

اجنبی: جو ملنے والا ہے نہیں ملے گا ــ روؤگے ــ

بشیر: بھائی کی مار سے یہ رونا بہتر ہے ــ ہوسکتا ہے اس دروازے کے پیچھے بھی ــ

اجنبی: کس دروازے کے پیچھے خواہشیں مقفّل ہیں، خواب قید ہیں، یہ جاننے کے لیے عمر چاہیے ۔ میں ابھی تک نہیں جان پایا، کہ فلتھ ڈپو کا وہ چور دروازہ کون سا ہے جو صاف ستھرے شہر میں کھلتا ہے ــ

بشیر: (تمسخر سے) تمھیں یقین ہے، ایسا چور دروازہ ہے؟

اجنبی: اگر صاف ستھرا شہر ہے تو چور دروازہ بھی ہوگا۔

ناصر: (دروازے کو کھولنے کے لیے زور لگاتے ہوئے، دانت بھینچ کر) ــ یا علیؑ۔

پہرے دار: (دور، آواز) جاگتے رہنا بھئی اووووو ــــ

دروازہ کھلتا دیکھ کر، اجنبی بے طرح بھونکنے لگتا ہے، بھونکتے بھونکتے کبھی کبھی اپنا منہ آسمان کی طرف بھی اٹھا لیتا ہے۔ بشیر یکدم اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ناصر اسے باہر ہی اجنبی کے پاس رہنے کا اشارہ کرتا ہے اور دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے۔ اجنبی بھونکتا ہوا ہنسنے لگ جاتا ہے۔

اجنبی: (بشیر کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے) بیٹھ جاؤ ــــ اندر خواب ہے۔

دوسرے کمرے میں
سٹور کا ڈمیوں (DUMMIES) والا حصّہ۔

تاریکی کے باعث صرف سائے ہی سائے نظر آتے ہیں، جیسے لوگ ساکت کھڑے ہیں۔ چند لمحے ناصر خود کو تاریکی کا عادی بناتا ہے۔ جس وقت اس پر سائے واضح ہونے لگتے ہیں تو سامنے، شیشے کی دیوار کے پار جیسے کاروبار شروع ہو چکا ہے۔ گاہکوں کی آمدورفت۔ چند سیکنڈ۔ ایک بے حد خوب صورت لڑکی شیشے کی دیوار سے پار، سٹور کے دروازے سے سٹور میں داخل ہوتی ہے۔ چال ڈھال، لباس، وضع قطع سے بہت اونچے گھرانے کی دکھائی دیتی ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کر اس کے پیچھے ناصر آتا ہے۔ بے حد نروس۔ اس کی آنکھوں سے لڑکی کے لیے چاہت عیاں ہے۔

ناصر: (آواز ـــ بازگشت، بازگشت کی بازگشت، لہجے میں انتہائی پیار، نرم لہجہ)۔ شہلا، شہلا ـــ شہلا۔ (شوکیس کی دیوار کے پار ناصر، لڑکی کو روک لیتا ہے اس سے کچھ کہتا ہے، لڑکی انتہائی غصّے میں پیر پٹختی اُسے ڈانٹ پھٹکار کرتی ہے تاریک کمرے میں ڈمیوں کے درمیان کھڑے ناصر کے سامنے یہ تمام منظر حقیقت ہے۔ اسی دم دکان کے مالک کی آواز اُبھرتی ہے۔)

دکان کا مالک: (آواز) بے شرم۔ غنڈے۔ بدمعاش، معزز خواتین کو چھیڑتے شرم نہیں آتی؟ سراج، صفدر، یوسف، پکڑلو اس بدمعاش کو لے جاؤ تھانے ـــ اور اس پر چوری کا کیس بھی ڈلوا دو (آواز سنتے ہی، شیشے کے پار، شہلا کے پاس کھڑا ناصر انتہائی نروس ہو جاتا ہے، شہلا غصّے میں پھنکارتی چلی جاتی ہے۔ ناصر بھاگنا چاہتا ہے لیکن جیسے راہِ فرار نہیں مل رہی۔ پھر اچانک اس رخ بھاگنا شروع کر دیتا ہے جہاں ناصر اب کھڑا ہے، تاریکی کی طرف۔ ماضی کا ناصر، حال کے ناصر کی طرف بھاگتا ہے، بھاگتا ہے۔ پھر یکدم جیسے ماضی کا ناصر، حال کے ناصر سے لپٹ جاتا ہے۔ اسی دم حال کا ناصر اسے چاقو گھونپ دیتا ہے۔)

ناصر: (چہرے پر پسینہ، دانت بھینچے ہوئے) غنڈے، بدمعاش، معزز خاتون کو چھیڑتے شرم نہیں آتی ـــ! تجھے شہلا سے بات کرنے کی جرات کرتے شرم نہیں آتی۔ بے شرم

بے شرم ۔ بے شرم (بار بار چاقو کے وار کرتا ہے) یہی تمھاری سزا ـــ (بشیر، جیسے ناصر کی آواز سن کر، گھبرایا ہوا تیزی میں داخل ہوتا ہے ۔ باہر اجنبی کی بھو نکار جاری ہے ۔)

بشیر: ناصر ـــ (بشیر کی آواز آتے ہی ہم ناصر کے ساتھ لپٹے ناصر کا چہرہ دیکھتے ہیں جو دراصل کمرے میں کھڑی ڈمی ہے) ناصر ـــ (ناصر، بشیر کی آواز سن کر چونکتا ہے ۔ ڈمی سے علاحدہ ہوتا ہے ۔ چاقو، ڈمی کی پسلی میں کھبا ہے ۔ ناصر بشیر کو دیکھتا ہے ۔ بشیر حیران و پریشان کھڑا ہے ۔ ناصر تیزی سے باہر کو چل دیتا ہے ۔ بشیر اس کے پیچھے)

دروازے سے باہر،

ناصر سامان سمیٹ کر، تیسرے دروازے کی طرف پلٹتا ہے ـــ اجنبی کی بھونکار ـــ

بشیر: (جاتے ہوئے، بہت سنجیدگی سے) میں جا رہا ہوں ۔

ناصر: (اس کو بازو سے پکڑ کر روکتے ہوئے) یہ ـــ یہ آخری دروازہ، اس کے پیچھے یقیناً جنت ہے بشیر ـــ تم چلے گئے تو اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کرو گے ۔ یہ دروازہ خوابوں میں آکر تمھیں ڈرایا کرے گا ۔ (اسے چھوڑ کر تیسرے دروازے پر فوراً کام شروع کر دیتا ہے)

اجنبی: (بشیر کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے) ایک دروازہ ہمیشہ آخری ہوتا ہے ۔ یہی راز ہے ۔ جب تم آخری دروازہ کھولتے ہو تو پتا چلتا ہے کہ یہ آخری دروازہ نہیں تھا، کہ اس کے بعد ایک اور دروازہ ہے، یوں تم دروازے توڑتے یا تو مر جاتے ہو یا پھر تھک ہار کر دروازے کے اسی طرف زندہ رہنے کی کوشش کرنے لگتے ہو اور نفرتیں پالنے لگتے ہو ۔

ناصر: (دروازے پر کام کرتے ہوئے جھنجھلا کر) تم چیپ فلسفے کی، چیپ کتاب کا چیپ ایڈیشن ہو ۔

اجنبی: جو تمھارے ذہن کے چھاپے خانے سے چھپا ہے ۔

بشیر: (یکدم چونک جاتا ہے، بے حد گھبراہٹ ۔ سامنے گلی کی نکڑ کی طرف اشارہ) ناصر ـــ

وہ ـــ وہ ـ (دور سے پہرے دار آتا دکھائی دیتا ہے ۔ ناصر یکدم گھبراتا ہے ۔ پھر خود پر قابو پاتا ہے ، جلدی جلدی سامان سمیٹتا ہے)

پہرے دار: (ذرا دور سے) جاگتے رہنا بھئی او وو وو وو ـــ (ناصر اطمینان سے کھڑا ہوکر سگریٹ سُلگاتا ہے ۔ اجنبی مسکراتا ہے ۔ پہرے دار ان کے قریب آجاتا ہے ۔ بشیر گھبراکر اٹھ کھڑا ہوتا ہے) ـــ کیا ہو رہا ہے یہاں ـــ ؟

اجنبی: چوری ـــ (ناصر اور بشیر گھبرا کے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

پہرے دار: چوری ـــ ؟ میری موجودگی میں ـــ

اجنبی: یہی تو معرفت کی بات ہے ـ (ہنستا ہے ۔ بھونکنے لگتا ہے)

ناصر: یہ دیوانہ ہے ۔ بکتا ہے ۔ ہم الیکٹریشن ہیں اور ـــ

بشیر: (جلدی سے جھک کر تھیلا اٹھاتا ہے) بالکل ـ (تھیلے سے دستانے نکالتا ہے) یہ دیکھو ـــ ہم ـــ

ناصر: ہم شکل سے چور لگتے ہیں ـــ ؟

بشیر: بھائی صاحب ـــ ہم نے کام ختم کرلیا ہے ۔ بس جا ہی رہے ہیں ـــ چلو ناصر ـــ

اجنبی: (پہرے دار سے) چور ہیں ـــ

پہرے دار: (ناصر اور بشیر سے) بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ ـــ (دھونس کے طور پر جیسے چیخنے لگتا ہے) چور ـــ چور ـــ چو ـــ

ناصر: (فوراً بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے) شور نہ مچاؤ احمق ـــ اس ۔ اس دروازے کے پیچھے ایک سیف ہے ۔ جس میں ہمارا مستقبل ـــ ہم ، ہم اس کے وارث ہیں ، لیکن اب تک محروم ہیں ، اس لوٹ کھسوٹ کی دنیا میں ـــ تم ، تم بھی تو اس کے وارث ہو ـــ اگر اپنا حق لینا چاہتے ہو تو ہماری حفاظت کرو ۔

پہرے دار: (انتہائی جذباتی) میری توہین کرتے ہو ـــ ! تمھارے ہاتھوں قتل ہو جانا پسند کروں گا لیکن اپنا فرض پورا کرکے رہوں گا ـــ تم سمجھتے ہو ، مجھے کاغذ کے چند ٹکڑوں کے عوض خرید لوگے ۔

اجنبی: خریدنا نہیں چاہ رہا ہے یار ـــ رشوت دے رہا ہے ۔

ناصر: (جلدی سے ، جیسے بولی دیتے ہوئے) ایک ہزار ـــ دو ہزار ، چار ہزار ـــ پانچ ـــ

پہرے دار: (جس کی آنکھیں بولی کے ساتھ ساتھ پھٹتی جاتی ہیں۔ فوراً) پانچ ہزار۔ ٹھک گئی۔

ناصر: (دروازے کی طرف پلٹتے ہوئے) اب تم آنکھیں بند کرلو، جیسے کچھ ہو ہی نہیں رہا۔

پہرے دار: (آنکھیں بند کرتے ہوئے) کچھ نہیں ہو رہا۔ (جاتے ہوئے بلند آواز سے) جاگتے رہنا بھئی اووووو۔۔ (آنکھیں کھول کر یکدم پلٹتا ہے) اگر چوری کر کے بھاگ گئے تو۔۔۔؟

اجنبی: تمھارا شیئر دے کر جائیں گے یار۔۔۔ شریف لوگ ہیں، میں ان کی ضمانت دیتا ہوں۔

پہرے دار: (کچھ سوچ کر) ٹھیک ہے بھونکا سائیں۔۔۔ پر یاد رہے۔ میں ایک فرض شناس، ایمان دار پہرے دار ہوں، کوئی جاگ گیا تو فوراً پکڑوا دوں گا۔

ناصر: تم بے فکر رہو یار۔۔۔ اب جاؤ گلی کے نکڑ پر۔۔۔

پہرے دار: (پلٹ کر جاتے ہوئے) جاگتے رہنا بھئی اووووو۔۔۔

اجنبی: (خود کلامی) جاگنے کی اذیت، سونے کی اذیت، زندہ رہنے کی اذیت، فاقہ اذیت، روٹی اذیت، خواب اذیت، حقیقت اذیت، زندگی اذیت، موت اذیت، اذیت، اذیت، اذیت۔۔۔ (لفظ بھونکار میں اتر جاتے ہیں)

بشیر: (جھنجھلا کے) باتیں، باتیں، باتیں۔۔۔ تم بھی باتوں کے کھلاڑی ہو، لفظوں کی بوچھار کرتے ہو کہ کچھ بھی نہیں پاتے۔۔۔ جلدی کرو ناصر، میرا بھائی بہت کینہ ہے۔ بالکل فرمان ہے، وہ مار مار کے مجھے۔۔۔

ناصر: کیا عورتوں کی طرح چلّا رہے ہو۔ جاؤ لے آؤ جا کر ٹرالی۔ (بشیر یہ سنتے ہی چلا جاتا ہے)

اجنبی: (خود کلامی) لفظ، بوچھار، وار، اداس نسل، خوابوں کی کربلا۔ خواب چوری، خیال چوری، عمل۔ چوری، فاقہ۔ چوری، باپ۔ چوری، ماں۔ چوری، شہلا۔ چوری، رضیہ۔ چوری، رضیہ چوری۔ رضیہ، رضیہ۔ (اجنبی کے آخری لفظ ناصر کے چہرے پر اوور لیپ ہوتے ہیں، ناصر بہت تندہی سے دروازہ کھولنے میں مصروف ہے، اجنبی کا مکالمہ ختم ہوتے ہی ناصر کے ہونٹوں سے سرگوشی میں رضیہ کا نام نکلتا ہے۔ وقت ٹھہر جاتا ہے۔ ناصر کے چہرے پر تاثرات جامد ہو جاتے ہیں)

ایک باغ کا تنہا گوشہ، رضیہ کے مکالمے کے دوران ناصر اسے خواہشوں بھری حسرت سے دیکھتا رہتا ہے۔ جہاں جہاں رضیہ کے مکالمے میں وقفہ

آتا ہے وہاں وہاں تنہا پرندے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

رضیہ: ہاں، رضیہ۔ کیا۔؟ شہلا۔؟ کون ہے وہ۔؟ خیال ہے؟ بھئی ایسی باتیں نہ کیا کرو، میری سمجھ میں نہیں آتیں؟۔ تو میری اماں سے تمھاری اماں نے کیا کہا۔؟ تم ہی نے کہا ہوگا کہ جب تک رضیہ کو شہلا بنانے کے اہل نہیں ہوجاتے، شادی نہیں کروگے۔ بتاؤگے نہیں، شہلا کون ہے؟۔ اچھا بابا اچھا۔ (ہاتھ جوڑ دیتی ہے) اب نہیں لوں اس کا نام۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا، منگنی شدہ لڑکی کی حالت ادھ کٹے سیب کی طرح ہوتی ہے، جس کی سطح کا زنگ اسے آہستہ آہستہ چاٹتا رہتا ہے۔ مجھے، مجھے اس زہر سے بچالو ناصر۔ وہ۔ وہ وقت کب آئے گا۔؟

تیسرے دروازے سے باہر، ناصر کے جامد چہرے پر وقت پگھلتا ہے۔

ناصر: (زیرلب، تندہی سے دروازے پر کام کرتے ہوئے) وقت آگیا ہے رضیہ۔ یہ/یہ دروازہ کھل جائے۔

اجنبی: (اپنی دھن میں) کھل سم سم۔ مہنگائی، کھل سم سم۔ رضیہ، شہلا، ماں، کھل سم سم۔ بال بچے راشن، کھل سم سم۔ خواب کھل سم سم، حقیقت کھل سم سم، محبت، بیکاری۔ (اجنبی کی خودکلامی جاری رہتی ہے)

ناصر: (دروازے پر کام ختم کرکے، اُسے زور سے دھکیلتا ہے) یا علیؓ۔ (دروازہ کھل جاتا ہے۔ ناصر تیزی سے اندر جاتا ہے)

تیسرے کمرے میں: مدھم مدھم روشنی، جو باہر دکان کے بڑے دروازے کی طرف سے آرہی ہے۔ ناصر تیزی سے چاروں اور نظریں گھماتا ہے۔ ایک کونے میں سیف پڑا ہے۔ سیف پر نظریں پڑتے ہی اس کی طرف لپکتا ہے اُسے دیوانہ وار چومنے لگتا ہے۔

ناصر: (سیف کو چومتے ہوئے) روشنی۔ روشنی۔

بشیر: (بے حد گھبرایا ہوا، ہیجان میں داخل ہوتا ہے) ناصر — ناصر — میرے بھائی کی ٹیکسی۔ (ناصر کو جھنجھوڑتا ہے) کوئی، کوئی ٹیکسی اڑا کے لے گیا ہے ناصر — میں — میں جارہا ہوں تھانے — رپٹ لکھوانے — (ناصر اسے پلٹ کر دیکھتا ہے۔ بشیر تیزی سے باہر نکلتا ہے۔ ناصر اس کے پیچھے لپکتا ہے)

تیسرے دروازے سے باہر: اجنبی خود کلامی میں مبتلا ہے

اجنبی: یاس، نامرادی، چور — نرم بستر موسیقی، نیند چور —

ناصر: (بشیر کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے) بشیر، تمھارے خواب — (بشیر اس سے بازو چھڑا کر تیزی سے چلا جاتا ہے، ناصر فوراً دروازے کی طرف پلٹتا ہے۔ پھر رک کر اجنبی کی طرف پلٹتا ہے، جس کی خود کلامی اب ہیجان کی طرف رواں ہے) سیف بھاری ہے — آؤ — ہم دونوں مل کر — تمھارا شیئر —

اجنبی: (اپنی دھن میں) شہر کے مساموں میں چور پھنسے ہیں۔ محافظ چور، محفوظ چور، ظالم چور، مظلوم چور، غاصب چور، کام چور (ناصر، اجنبی سے مایوس ہو کر کمرے میں چلا جاتا ہے۔ اجنبی کی خود کلامی میں ہم INTER—CUTS میں ناصر کو سیف کے ساتھ نبرد آزما دیکھتے ہیں)۔ ہام چور، سام چور، راج چور، تم چور، میں چور، ہم چور، چور، چور، چور، چور — (اب اجنبی کا ہیجان عروج پر ہے، وہ مسلسل چور چور کیے جارہا ہے، گلی میں کھلتی، گھروں کی کھڑکیاں کھلتی ہیں۔ لوگ، عورتیں، مرد کھڑکیوں سے جھانکتے ہیں۔ ناصر بے حد بوکھلا کر کمرے سے باہر نکلتا ہے۔ اجنبی، چور چور کہتا ہوا ایک طرف کو چل دیتا ہے۔ لوگ گھروں سے باہر آچکے ہیں۔ ناصر جس طرف فرار کے لیے بھاگنا چاہتا ہے، لوگ، چور چور، چیختے ہوئے اس کا راستہ روک لیتے ہیں۔ ناصر ان کے نرغے میں یوں آجاتا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا ہجوم میں ناصر کون ہے، یعنی چور کون ہے اور سادھ کون۔ دور اجنبی جاتا نظر آتا ہے۔ ہم سارے منظر سے رفتہ رفتہ اتنے دور ہٹ کر رک جاتے ہیں کہ بھاگتے ہوئے لوگ اب مارکیٹ میں نظر آتے ہیں، جگمگاتے نی اون سائینو اور اونگھتے بلبوں کی روشنی میں چیونٹیوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ تین سیکنڈ بعد، دور

پہرے دار کی آواز سنائی دیتی ہے)

(آواز) جاگتے رہنا بھئی اوو وو وو ——— ("بھئی اوو وو" ——— کے

رفتہ رفتہ معدوم ہونے کے ساتھ ساتھ منظر بھی معدوم ہوجاتا ہے)

— فیڈ آؤٹ —

○

انور سجّاد

# جدید تخلیق

فرد کی ذلت، تنہائی، بے بسی، بے سروسامانی، احساسِ پشیمانی، انسان کی بے حقیقتی، گھٹن، مایوسی اور پھر ان سے پیدا شدہ ردِّ اعمال، بعض حالتوں میں اِس صورتِ حال کے خلاف شدید احتجاج، بعض اوقات اس صورتِ حال کو قبول کرکے اس سے خود رحمی کا شکار ہونا اور تلذذ حاصل کرنا، بعض کیفیات میں اِس صورتِ حال کی محض نشان دہی، غیر جذباتی اعروضی ـــــ دریافت کرنے کی جستجو، جیسے سرجری کی اصطلاح میں EXPLORATORY LAPRATOMY کہتے ہیں کہ جب پیٹ کے درد کے تمام طریقے راز افشا نہ کرسکیں تو چاک کرکے دیکھا جائے، اندر ہے کیا آخر جو اذیت ناک ہے کہ جس کا پتا اب تھرمامیٹر تو کیا کوئی بھی ٹیسٹ نہیں دیتا۔ "ادب لاش نہیں، جسے ڈاکٹر اور اس کے چند شاگرد پتھر کے میز پر لٹاکر پوسٹ مارٹم شروع کردیں۔ ادب بیماری نہیں بلکہ بیماری کا ردِّ عمل ہے۔ دوا بھی نہیں جس کے استعمال کے لیے اوقات اور مقدار کی پابندی عائد کی جاتی ہے۔ ادب درجۂ حرارت ہے، اپنے ملک کا ـــ وہ اس کی صحت اور علالت کی خبر دیتا رہتا ہے۔" [1]

فرد کی ذلت، تنہائی، بے بسی، بے سروسامانی وغیرہ کے متعلق صنعتی انقلاب سے لے کر ہمارے برصغیر کے مخصوص حالات (جو شاید ہماری قبیل کی نوزائیدہ اقوام کا مقدر ہیں) بہت کچھ لکھا پڑھا جاچکا ہے کہ فرد معاشرے سے کس طرح کٹا ہے، کاٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔ کس طرح اپنی ذات میں سمٹا ہے یا سمیٹ کر اپنی ذات میں گھسیٹر دیا گیا ہے۔

---

[1] منٹو

سیپ کے اندر جب کوئی ریت کا ذرہ داخل ہوتا ہے تو وہ اسے اُگلنے کی خواہش میں ؛ اس کی رڑک سے نجات پانے کے حصول میں اپنے وجود کے تمام لعابوں سے لیس ، اس پر حملہ آور ہوتا ہے ۔ یہ اس کا مدافعتی عمل ہے ۔ سیپ کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس عمل سے ایک ایسی چیز جنم لے رہی ہے ، جو بیش بہا ہے ۔ یہ ایک ایسا عمل ہے ، تجریدی عمل ، کہ سیپ بغیر کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ، موتی کی تخلیق کرتا ہے ۔ یہ اس کے REFLEXES کا نتیجہ ہے جس سیپ کے REFLEXES تیز ہوتے ہیں ، جس کا ردِّ عمل ریت کے ذرّے کی رڑک سے نجات حاصل کرنے کا اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ دیوانہ وار اپنے لعاب سے وار کرتا ہے ، وہ سیپ اس دیوانگی میں اسی قدر بڑے اور خوبصورت موتی کو وجود میں لاتا ہے ۔ تخلیقی لمحے میں دیوانگی کا ہونا ضروری ہے ۔ درسی علم محض اتنا کافی ہے کہ کاغذ ، قلم ، روشنائی اور الفاظ کو کیوں کر استعمال کیا جاسکتا ہے ۔ قلم ، کاغذ اور لفظ اسی طرح ذریعے ہیں ، جیسے مصوری کے لیے رنگ ، برش ، کینوس وغیرہ ، مجسمہ سازی کے لیے مجسمہ سازی کا سامان یا موسیقی کے لیے ساز ۔ البتہ تخلیق کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان اس قسم کا سیپ ہو جس میں ریت کے ذرے سے جنگ کا استطاعت ہے ۔ ورنہ سیپ کی تو کئی اقسام ہیں ۔ موتی کلچر بھی کیے جاتے ہیں لیکن سچا موتی ہی سچی تخلیق ہے ۔ سچی تخلیق ہی سچا موتی ہے ، جس کی پہچان کے لیے اس علم کی ضرورت ہے جو محض لفظ نہیں بلکہ لفظوں سے ماورا ، حقیقت اور سچائی کو تلاش کرنے کا علم ، جس کے ادراک کے لیے کسی بھی سیاسی پارٹی کے منشور کا مرہونِ منت ہونا قطعی ضروری نہیں ۔

لیکن یہ تخلیقی عمل تو بعد میں شروع ہوتا ہے ، سب سے پہلے تو ریت کا ذرہ ہے جو کابوسی حقیقت بن جاتا ہے ۔

کیا یہ دنیا ، یہ زندگی ، یہ جیسے جانے کی خواہش میں ریت کے ذروں کی رڑک جو ہر لمحہ ہمارے تنفّس میں کھٹتی چلی جاتی ہے ، کسی ڈراونے خواب ، کسی کابوس کی طرح ہیں ؟ مہنگائی ، فاقہ کشی ، چیتھڑوں میں ملبوس جسم ، جنسی ناآسودگی ، جبر ، استبداد ، رشوت ، چور بازاری ، اسمگلنگ ، ابن الوقتی ، مصلحت اندیشی ، ریاکاری ، منافقت ، علاقائیت ، نفرت ، فسطائیت ، انتشار ، جنگ ، اور انسان کے زندگی کرنے کے عزم پر لٹکتی ڈیموکلیس کی تلوار ـــــ اور پھر ہم سب کی منتظر ، موت ـــــ کیا یہ حقائق ، ڈراونے خواب کی طرح غیر حقیقی نظر نہیں آتے ؟ اگر حقیقت میں دنیا یہی ہے تو ان مختلف ردِّ اعمال کے ذریعے ، جو انسانوں کی مختلف شخصیتیں متعین

کرتی ہیں، انسان انھیں تبدیل کرنے کی خواہش کیوں کرتا ہے ؟ اگر انسان ان ہی حقیقتوں کا حصّہ ہے اور اگر یہی حقیقتیں اس کے اندر رچی بسی ہیں تو پھر یہ انسان کے سامنے ڈراونے خوابوں کی صورت کیوں آتی ہیں ؟ انسان کو تو پتا ہی نہیں چلنا چاہیے کہ یہ بُرائیاں ہیں کہ اس کے پاس تقابل کے لیے کچھ نہیں۔ لیکن ہم ایک دوسرے سے محبت کرنے ، ایک دوسرے کے غموں اور خوشیوں کو سانجھ کرنے ، دنیا کو خوشگوار بنانے ، ایک دوسرے کو بہترین زندگی کرنے میں مدد دینے کے لیے آئے ہیں تو کیوں ؟ پھر کیوں ؟ یہ سب کچھ کیوں ؟ ہم ان تمام آدرشوں کو، خواہشوں کو، حقیقتوں میں ڈھالنے کا خواب دیکھتے ہوئے ، اپنے امر ہونے کا یقین رکھتے ہوئے کیوں مر جاتے ہیں ؟ مجھے یہ ساری صورتِ حال گدگدی کرتی ہے۔ میں اپنے ہمعصر ساتھیوں کے ساتھ مل کر اتنا ہنستا ہوں ، اتنا ہنستا ہوں کہ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے یہ وہی لمحہ ہوتا ہے جب میرے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے۔ ہنسی جانے کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ میں آنسوؤں کی رڑک سے نجات پانے کے لیے کاغذ پر ان کے گرد قلم کے لعاب سے حصار کھینچنے لگتا ہوں۔

تب ان حقیقتوں کا پَرتو جنم لیتا ہے جو خوابوں کی طرح، اکثر ڈراؤنے خوابوں کی طرح ہمارے سامنے آتی ہیں۔ کیا ان حالات میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ آج کا ادیب اپنے معاشرے کے سیاق و سباق میں رہ کر قلم نہیں اُٹھاتا ؟ کیا وہ اپنے مسائل سے ( یہ مسائل گہرے تجزیے کے بعد ان کے ذاتی مسائل نہیں رہتے ، بلکہ درحقیقت تمام سماج کے مسائل بن جاتے ہیں، سماج کے پیدا کیے ہوئے مسائل بھی ، جن کا شکار فرد ہوتا ہے ) لاتعلق رہتا ہے ؟ یہی مسائل اس کی قوم، اس کے ملک کے مسائل ہیں۔ کیا جب وہ اپنے مخصوص انداز میں ( ذاتی سطح پر یا عمومی سطح پر ، احتجاج ، مایوسی یا رجائیت کے انداز میں ) اپنا ردِّ عمل متعین کرتا ہے تو وہ بے حسّی اور سرد مہری کا اظہار کرتا ہے ؟ اس پر آشوب زمانے میں آگہی کی جستجو ، زندگی کی معنویت کی کھوج اور اپنے وجود کے مقصد کی تلاش ، ماحول سے ماورا نہیں ، ہو نہیں سکتی ، کبھی ہو نہیں سکتی ، کبھی ہوئی نہیں۔ ہر دور میں تلاش کا یہ سفر جاری رہتا ہے۔ آج اس کا احساس اتنی شدت سے اس لیے ہوتا ہے کہ آج سے پہلے انسان ان مخصوص حالات سے دو چار نہیں ہوا تھا۔ رفتار کے سامنے وقت سمٹ گیا ہے۔ احساس کے سامنے حدود مٹ گئی ہیں۔ آج پاکستان میں رہتے ہوئے بھی ، پاکستانی ہوتے ہوئے بھی میں ہر جگہ موجود ہوں۔ ویت نام

ایسے ملکوں میں انسان کشی، میری موت ہے۔ آزادی کی جنگ لڑنے والی، آزادی کی حفاظت کرنے والی ہر قوم کے دوش بدوش ہوں۔ یو۔ایس۔اے میں امریکی نیگرو کی گردن میں پھانسی، میرے سانس کو کاٹتی ہے، سلمز کے باسیوں کی بھوک میرے پیٹ میں خلا پیدا کرتی ہے۔ لاطینی امریکہ اور افریقہ ایشیا کی نو آزاد قوموں کی امیدیں میری امیدیں ہیں، ان کے خوف، ان کی تشویش، میرے خوف، میری تشویشیں ہیں۔ وہ سب مجھ میں زندہ ہیں، میں ان میں زندہ ہوں۔ حتیٰ کہ مجھے ڈر ہے کہ ہائیڈروجن بموں اور جوہری جنگ کے امکانات سے پیدا شدہ خدشات، سرمایہ دارانہ صنعتی نظام کے باوصف چند لوگوں کی اپنے لیے پیدا کی ہوئی آمرانہ کثرتوں سے تنگ آکر، اپنے بزرگوں کی منافقتوں کے پیدا کیے ہوئے، جس سے گھبرا کر اپنے گھروں سے نکلے ہوئے سیاح، ہپی، کہیں یہ ہمارے مستقبل ہی کا تو پرتو نہیں ؟! میں خائف ہوں کہ ہمارے نظام کا پلڑا اسی کی طرف جھکتا دکھائی دیتا ہے۔ نشہ، ہر قدر کی تضحیک، موسیقی کی دیوانی دھنوں پر رقص، دیوانہ وار وجد، دنیا سے بے تعلق، فنا فی الوجود، فنا فی الذات (فنا فی اللہ ؟) جنہیں یہ راہ روی (راہ روی ؟) اس معاشرے کے ملامتی فرقے کے صوفی ؟! ممکن ہے ان لوگوں میں چند ایک وہ سیپ ہوں جو ذرّے کے گرد لعاب نہ بن سکے۔ یا جن کے REFLEXES اور MECHANISMS میں مدافعت کی استطاعت کو مفلوج کر دیا گیا ؟ یہ خلیے تو نہیں جو نارمل خلیوں میں سے تھے پر جیسے سرطان کی وجوہ میں ایک خلیہ اپنے نارمل ساتھیوں سے مختلف محرکات کے باعث گمراہ ہو کر سرطانی قوتوں کا حامل ہو جاتا ہے[1] یہ مختلف قوتوں کا شکار ہو گئے ؟ لیکن ان میں اکثر مجھے ہڈ حرام نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے، سچائی کی تلاش کے بہانے اپنے مقام کو تیاگ کر راہِ فرار اختیار کر لی ہے۔ جو بھی ہو، اس قسم کے خلیے پیدا کرنے کی عیاشی وہی قومیں برداشت کر سکتی ہیں جو سرمایہ دارانہ صنعتی نظام اور اس کی اقدار کو اپناتی، تبلیغ کرتی اپنے عروج پر پہنچ کر مائل بہ زوال ہوں۔ میں اس قسم کے نظام کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ میں اس کے نتائج، اس ردِعمل کو قبول نہیں کر سکتا۔ مجھے سرگرمی سے اپنی ذات کی تخلیق، اپنے معاشرے کی تخلیق میں حصّہ لینا ہے کہ ہم نے تو ابھی عروج کی سیڑھی کے رخ قدم نہیں اٹھایا۔ مجھے سیڑھی کا چناؤ بھی کرنا ہے کہ جس پر آخری قدم کوئی نہ ہو، کوئی انتہا نہ ہو کہ

---

[1] بائنڈ

زوال کا امکان پیدا ہو۔ میں حقیقت کی تلاش، معنویت کی کھوج میں سیڑھیاں چڑھتا ہی چلا جاؤں، ہر نیا قدم ساتھیوں کے قدموں کے ساتھ مِل کر اُٹھے۔ جب ایک حقیقت کا سراغ ملے تو نئی حقیقت کی جستجو شروع ہوجائے۔ اسی طرح یہ عمل جاری رہے۔ حتّا کہ گھڑیاں، دن، سال، صدیاں، قرن بیتتے رہیں کہ حقیقت کی تلاش کا عمل انقلاب ہے اور "انقلاب ہر جگہ اور ہر شے میں ہے یہ لامحدود ہے۔ کوئی انقلاب حتمی نہیں ہوتا۔ اعدادِ صحیح کی کوئی انتہا نہیں۔ سماجی انقلاب، اعدادِ صحیح کے اس بے انتہا سلسلے سے ایک ہے۔ اصولِ انقلاب (محض) کوئی سماجی اصول نہیں۔ یہ بے پایاں حد تک عظیم تر ہے"[1]۔ میں اس عظمت کا ایک حصّہ بننا چاہتا ہوں۔

اِس لیے آج کے لِکھنے والے کو مجہول، بے راہرو، کج فہم، بے تعلق اور ذہنی مشت زن ایسے خطابات سے نوازنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"جب کسی انسان کا لہجہ بدل جاتا ہے۔ جب کوئی انسان ہنستے ہنستے رونے لگتا ہے۔ جب راگ کے مدھم سُر ایکا ایکی اونچے ہوجاتے ہیں، جب بچہ بلکنے لگتا ہے تو آلہ مقیاس الصوت یعنی آواز ماپنے والے آلے سے میکانکی طریقہ پر اس تبدیلی کو نہیں جانچتے۔ جو اہلِ دانش ہیں، جو صاحبِ ذوق ہیں، ہمیشہ اس کیفیت، اس جذبے، اس محرک کو ٹٹولنے کی کوشش کریں گے، جس نے یہ تبدیلی پیدا کی"[2]۔ یہ مجہولیت، بے راہ روی، کج فہمی، بے تعلق اور ذہنی مشت زنی اگر آپ کو نظر آتی ہے تو آپ اس کی پیدائش میں برابر کے شریک ہیں، یہ آپ ہی سے پیدا ہوئی ہے۔ آج کے ادیب کو اس قسم کے خطابات سے نوازنے والے وہ پدم شری، ستارۂ خدمت وغیرہ حاصل کرنے کے خواہش مند، سنگھاسنوں کی زینت، ریاکار ہیں جنہوں نے ادب پر سیاسی مسلک کا لیبل چسپاں کرکے ہمیں ورثے میں دینا چاہا۔ اور خود اپنی اپنی مصلحتوں، اپنی اپنی ہوسوں کے پیچھے سر دھڑ کی بازی لگا کر پڑ گئے۔ آج کے لکھنے والے کو کوئی سیاسی لیبل قبول نہیں کہ افادی اور اسی قبیل کے ادب کے ذریعے خوش گوار معاشرے کے سراب دکھانے والے شعبدہ باز ان کے سامنے ننگے ہیں۔ نئے لکھنے والے کو کسی قسم کی کٹھ ملائیت قبول نہیں۔ وہ کسی پارٹی ڈسپلن کو قبول نہیں کرتا کہ سیاسی منشور کے ذریعے حقیقت کے ادراک کی سعی ہمارے ہاں بے معنی ثابت ہوچکی ہے۔" وہ صرف ایک ڈسپلن میں ایمان رکھتا ہے اور وہ ہے حقیقت کی سچائی کی تلاش کے ساتھ وفاداری"۔ اس لیے وہ کسی سے

---

[1] زمیاتن [2] منٹو

سمجھوتا نہیں کرتا۔ نئے ادیب کی لا سیاست ہی اس کا سیاست میں حصّہ ہے کہ وہ ہر قسم کی گروہ بندیوں، فرقہ واریوں، منافقتوں، مصلحت کوشیوں کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ معاشرے کے سیاق و سباق میں اس کی اپنی ذات کی حد بندی بھی دراصل تمام حد بندیوں کو توڑنے کی خواہش اور جد و جہد کا اظہار ہے۔ بعض ان حد بندیوں کے خلاف احتجاج تک ہی خود کو محدود رکھتے ہیں اور بعض اس منزل تک پہنچنے کے لیے راہ کا سراغ پانے کی جستجو بھی کرتے ہیں کہ وہ کون سا نظام ہو سکتا ہے، جس سے ذات اور کم ذات کی سرحدیں مٹ سکیں۔
"کیا ہم سب کے بنیادی خواب ایک سے نہیں ہیں؟ کیا ان خوابوں میں ہمارے مشترک کرب، تشویش، مشترکہ خوابوں کی جھلک نہیں ہوتی؟"[1]

ظاہر ہے کہ آج کا لکھنے والا جب اپنے معاشرے کے تمام تضادات کا شکار بیک وقت ہوتا ہے تو یاس، ناامیدی، قنوطیت، رجائیت، سکون، ہیجان، محبت، نفرت، مذہب، لامذہبیت، تخلیق کرنے کی آرزو، مٹا دینے کی خواہش، سوشلزم، امپرئیلزم، سرمایہ داری، محنت کشوں کی جد و جہد، جاگیرداری، کسانوں کی کشمکش کا اظہار لکھے ہوئے لفظوں میں ایک نئے انداز سے ہوتا ہے۔ کبھی خوابوں، ڈراؤنے خوابوں کی صورت، کبھی زمان و مکان کی حدود درہم برہم، کبھی شعوری رو، کبھی لاشعور کا لیبرنتھ، کبھی علامتیں، کبھی استعارے۔ لہٰذا ابلاغ کا مسئلہ! ابلاغ کا مسئلہ؟

○

---

[1] آئینکو

انور سجاد

# پنڈارے اور عہد نامہ

"میں لفظوں سے بنا ہوا آدمی ہوں۔ میں ہر لمحہ دائیں بائیں ہوتا رہتا ہوں۔ ہم سب کسی نہ کسی وقت، کسی نہ کسی جگہ دائیں بائیں ہوتے رہتے ہیں۔ ہر آدمی کو زندہ رہنے کے لیے دائیں بائیں ہونا پڑتا ہے۔ جو بیچ میں رہ جاتا ہے پس جاتا ہے۔"

یہ جملہ سرمد صہبائی کے کھیل "ڈارک روم" کے ایک کردار صدیقی کا ہے۔ جو ایک مقامی اخبار کا سکینڈل رپورٹر ہے اور جو لفظوں سے بنا ہونے کے باوجود اپنے طبقاتی، معاشرے کی بورژوا سوچ کا شکار ہے کہ وہ اپنے تضادات کو مٹا نہیں پایا۔ اس کے لیے زندہ رہنے کا امکان حتمی طور پر دائیں یا بائیں ہونے میں نہیں بلکہ دائیں بائیں فلور تبدیل کرنے میں ہے ـــــ اس لیے کہ زندہ رہنے اور زندگی کرنے کا SUBTLE کا فرق ابھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن اسے اتنا احساس تو ہے کہ بیچ میں رہ جاتا ہے وہ بالاخر پس جاتا ہے، ڈارک روم میں فنا ہوکر رہ جاتا ہے۔ ڈارک روم میں فنا کر دیا جاتا ہے۔ جلد یا بدیر، بائیں ہاتھ کے وار سے یا دائیں ہاتھ کے وار سے اس کے لیے زندگی کرنے کا تو کیا، زندہ رہنے کا بھی کوئی امکان نہیں، کوئی جواز نہیں۔

میں لفظوں سے بنا ہوا آدمی ہوں، لفظ مجھ سے بنے ہیں کہ میں نے لفظوں کو جنم دیا۔ لفظوں نے مجھے جنا کہ میں جو ہوں، لفظ کی وجہ سے ہوں کہ ـــــ لفظ تھا، اور لفظ ہے، میں تھا۔ میں ہوں اور میں رہوں گا کہ لفظ میری دنیا ہے، معروضی حقیقتوں کی دنیا سے زیادہ حقیقی دنیا لفظ مقدس ہے کہ میرا عہد، میرا پیمان لفظ سے ہے۔ لفظ میرا ایمان ہے۔ جس کا لفظ ایمان نہیں وہ دلال ہے، وہ لفظوں کا پیشہ کراتا ہے۔ بیچتا رہتا ہے کمرشلائز کرتا

رہتا ہے۔ دائیں بائیں ہوتا رہتا ہے۔

نذیر ناجی کہتا ہے کہ لفظ روٹھ جائیں تو آدمی کچھ نہیں رہتا۔

لفظ میرے نجات دہندہ ہیں کہ میں لفظوں میں بکھرا ہوا، لفظوں میں سمٹ کر خود کو تخلیق کرتا ہوں کہ تخلیق، کہ جو لفظ ہے، تضادات کے منتشر شیرازوں کو یکجا کر کے شناخت کرتی ہے اور آخر کار ان تضادات کو مٹا کر اکائی کی صورت دیتی ہے جو کہ SPHINX کے تمام سوالات کا جواب ہے۔ اگر یوں نہ ہو تو انسان دائیں ہوتا ہے نہ بائیں۔ ڈارک روم میں فنا ہو جاتا ہے، فنا کر دیا جاتا ہے۔

میری تخلیق لفظ اور لفظوں کی تخلیق میں۔

لکھنے والے کا لفظ سے اور لفظ کا لکھنے والے سے یہ تخلیقی رشتہ کاغذ پر روشنائی کے ذریعہ اترنے سے پہلے عارضی ہوتا ہے لیکن تحریر میں آکر دائم ہو جاتا ہے۔ تب میرے لیے لفظ، خود کو ضرب دینے، یعنی مجھے MULTIPLY کرنے کا وسیلہ بنتے ہیں کہ وہ پڑھنے والے جن کی INTRA SUBJECTIVE REALITY میری اسی نوع کی حقیقت سے مطابقت رکھتی ہے، میں ان میں زندہ ہوتا ہوں، باقیوں کے لیے میں بے معنی ہوں اور وہ میرے لیے بے معنی ہیں۔

سو، طے پایا کہ میں، کہ جو ادیب ہے، میرا پہلا عہد لفظ سے ہے، لفظ کی حرمت سے ہے، میں جو تضادات سے کٹے، طبقاتی معاشرے میں اپنے بٹے ہوئے سانسوں کو یکجا کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہوں۔

وہ لفظ، کہ جو میرا نجات دہندہ ہے، اس معاشرے میں میری نجات اسی طور سمجھتا ہے کہ میں اسے اپنی ذات سے برآمد کر کے معروضی حقیقتوں کے حوالے سے اس سے استحصال، ظلم اور جبر پر وار کروں کہ بنیادی طور پر مجھے اپنے آپ کو معاشرے کی اسی، سانپوں اور سیڑھیوں والی لڈو (LUDDO) سے RESURRECT کرواناہے، سو، جانا یہ گیا کہ INTRA SUBJECTIVE REALITY طبقاتی شعور کو جنم دیتی ہے اور اسی نوع کی حقیقت سے آشنائی کی بدولت مظلوم، مجبور اور استحصال کیا گیا طبقہ اپنی ذات کا تشخص کرتا ہے۔ اس حقیقت سے ماورا کوئی شے نہیں جو لکھنے والا اس حقیقت سے انکار کرتا ہے۔ وہ غیر جانبداری کی جانبداری کا اعلان کرتا ہے اور راستے کے بیچوں بیچ، دائیں بائیں سے دامن بچا کر چلتا ہوا ڈارک روم میں پہنچ جاتا ہے اور جو لکھنے والا

مڑتا ہے، وہ جابروں، ظالموں اور استحصال کرنے والوں کے عہد ناموں پر دستخط ثبت کرتا ہے، ان کی سازشوں کا حصّہ بن جاتا ہے۔ یہ سازشیں چاہے بین القوم ہوں یا بین الاقوامی سطح پر۔ مظلوم طبقے پر عرصۂ حیات بالکل تنگ کرنے کے لیے ہوں یا مظلوم طبقے کو حقیقت کے ادراک کے راستوں سے بھٹکانے کے لیے ہوں یا ان کے اتحاد میں پھوٹ ڈلوانے کے لیے۔

نیرو بھی عہد نامے کے افق پر اپنی فڈل بجاتا، گاتا نظر آتا ہے کہ جب روم جل رہا تھا، اندھیرے آسمان کو سونگھتے، چاٹتے، نگلتے، شعلے اور بازاروں میں گرتے پڑتے بھاگتے، چیختے چلاتے جاندار، پر نیرو کی آنکھوں میں اس کی فڈل کی صورت اور کانوں میں نغمہ تھا کہ اُس کا عہد اپنی فڈل سے تھا ـــــ نیرو کون ہے؟

جب دشمن کی شناخت ہو جائے تو لفظ، خود اپنے سائے سے جنگ کرنے کے بجائے دشمن پر وار کرتے ہیں۔

لیکن لفظوں سے بنے وہ آدمی جو کبھی دائیں اور کبھی بائیں ہوتے رہتے ہیں۔ محض زندہ رہنے کے لیے، وہ مصلحت کوش، ابن الوقت ہیں جبکہ وہ دائیں ہوتے ہیں تو بائیں طرف آنکھ مار دیتے ہیں کہ ہم تمھاری طرف ہیں اور جب وہ بائیں ہوتے ہیں تو دائیں والوں کو آنکھ مار دیتے ہیں کہ تم فکر نہ کرو، دراصل ہم اپنا الّو سیدھا کر رہے ہیں۔ یہ جنس شاید حیوانی سطح پر زندہ رہنے کی قائل ہے کہ زندگی کرنے کے بجائے محض زندہ رہنا چاہتی ہے۔

کرنل سلی مین اپنی کتاب "پنڈاریز" میں پنڈاروں کو تین قسموں میں تقسیم کرتا ہے، جو کلکتہ سے روہیل کھنڈ تک وسطی ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اول قسم وہ تھی جن کا سو پشت سے پیشہ آبا ڈکیتی تھا۔ یہ لوگ اس وقت کسی قسم کے معاشی، معاشرتی یا سیاسی استحصال کے خلاف احتجاج نہیں کر رہے تھے بلکہ نسل در نسل ان کا طریق زندگی یہی چلا آیا تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ اس گروہ کے جدّامجد نے ڈکیت کو اپنا شعار کیوں بنایا، شاید کسی پیڑھی میں جاکر غور کرنے سے معلوم ہو کہ کسی نے سوشل آرڈر کے خلاف ڈکیتی ہی کو احتجاج سمجھا ہو لیکن چیتو کے زمانے میں یہ مسلّم تھا کہ یہ پروفیشنل ڈاکو ہیں۔ جنھیں اور کسی قسم کا کوئی آرڈر قبول نہیں۔ ان ڈاکوؤں میں شاید کوئی رابن ہڈ کی قسم کی بھی کوئی چیز پیدا ہوئی ہو جو ممکن ہے لوک کہانیوں یا گیتوں کی صورت اختیار کرتی ہم تک پہنچتے بدل گئی ہو۔ دوسری قسم ADVENTURERS یعنی طالع آزماؤں کی تھی جو کہ دائیں بائیں ہوتے رہتے تھے۔ مثلاً واصل محمد خاں، نوابانِ بھوپال کا مورثِ اعلیٰ اور

امیر خاں جو ریاست ٹانک کا مورثِ اعلیٰ تھا۔ یہ نوجوان امیر خاں کہ جو اپنے پاس تیس ہزار نفوس ہتھیاروں سے لیس رکھتا تھا۔ جسونت راؤ ہلکر کا تنخواہ دار تھا کہ جنگ کے وقت ہلکر کی طرف سے لڑے گا۔ پھر یوں ہوا کہ جب ہلکر صاحب کی فوجیں لارڈ لیک صاحب کی فوجوں کے سامنے صف آرا ہوئیں تو ہلکر صاحب نے امیر خاں صاحب سے آکر ساتھ دینے کو کہا۔ لیکن بوجوہ، ہلکر صاحب نے چونکہ پچھلے ماہ کی رقم امیر خاں صاحب کو ادا نہیں کی تھی اِس لیے اُس نے ساتھ دینے سے انکار کردیا اور سیدھا لارڈ لیک صاحب سے معاملہ طے کرکے بھاری رقم کے عوض اپنے پرانے تنخواہ دار کے خلاف میدان میں اتر آیا۔ تیسری قسم ان پنڈاروں کی تھی جو کسی ذاتی وجہ سے میدانِ ڈکیت میں کود ے تھے۔ کارمن کے عاشق کی طرح صرف PERSONAL VENDETTA لیے ہوئے، مجبوراً کہ ان کے لیے سوا اس قسم کی بغاوت کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ان میں سے کسی نے خود اپنے لیے راستے کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ چیتو اپنی روایت کے احترام میں اپنے پیشۂ آبا پر ڈٹا رہا امیر خاں ٹونکی کی قبیل کے لوگ طالع آزما تھے۔ اگر ہلکر اسے رقم دے دیتا تو لارڈ لیک فنا ہوجاتا۔ لارڈ لیک نے اسے خرید لیا۔ ہلکر برباد ہوگیا۔ ہوس، لالچ، مصلحت کوشی منتج ہوئی اس کے کبھی دائیں، کبھی بائیں ہونے میں کارمن کے عاشق کے سامنے چناو کا کوئی راستہ نہیں تھا کہ پنڈارہ بننا اس کا مقدر تھا۔ اس مقدر کو قبول کرنے کے بعد جب کبھی اس کی ذاتی (نفسیاتی) صورت حال کا CATHARSIS ہوجاتا تو وہ تائب ہوجاتا۔

جب میں نے لفظ کی حقیقت میں خود کو پہچانا تو مجھے چاروں طرف پنڈارے نظر آئے کہ وہ لوگ جنھیں میں نے سچا جانا تھا، معلوم ہوا کہ ان کا شجرہ دراصل امیر خاں ٹونکی یا واصل محمد خاں سے جاملتا ہے کہ محض زندہ رہنے کی خاطر دائیں بائیں ہوتے رہتے ہیں۔ دراصل اپنا الّو سیدھا کرتے رہتے ہیں کہ وہ لوگ جنھیں میں سچا جانتا تھا، دراصل کارمن کے عاشق ہیں کہ ذاتی VENDETTA کی خاطر انقلابی ہے کہ جب ان کا کتھارسس ہوگیا، وہ اپنی اصل کو لوٹ گئے۔ لیکن کبھی کبھی اپنی NUISANCE VALUE جتانے کی خاطر انقلاب کے راستے پر جھلکی دکھا گئے۔ یارو غضب خدا کا اگر یوں ہو کہ جن کی خاطر انقلاب کا نعرہ لگایا گیا ہو، ان کی PER CAPITA آمدنی کی قیمت تو روز بروز گھٹ رہی ہو اور لوگوں کو انقلاب کی راہ دکھانے والوں کے معیار زندگی میں روزافزوں ترقی ہوتی چلی جائے۔ جس نظام کے خلاف وہ انقلاب کے داعی ہوں اس نظام کے محافلوں

کے تمام فرقوں، سکریٹریوں سے لے کر پولیس افسران تک ان کی دوستیاں یاریاں ذاتی سطح پر ہوں کہ محفلوں میں من و تو کا فرق ہی مٹ جائے! بخدا مجھے کسی کے گھرانے کے خوش حال ہونے سے کوئی بغض نہیں۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان بزعم خود انقلابیوں کے گھرانوں کی خوش حالی کا راز کیا ہے؟ کم ازکم بچے کم ہونا تو نہیں۔ آخر ان کے پاس انقلابی راستہ چننے کا جواز کیا تھا؟

تب میں نے جانا کہ حقیقت اس میں ہے کہ جس نے بغیر کسی روایت کی اطاعت کیے، بغیر کسی مصلحت کوشی کے، بغیر کسی ذاتی پرخاش کے اپنے لیے خود حقیقتِ ثابتہ کے طور پر ہر قسم کی منع کو ٹھکرا کے راستہ چنا، کہ صرف اس طور پر اس راہ پر چل کر جنگ جیتنے والا غازی ہوتا ہے اور مرنے والا شہید، کہ یہ شخص اپنے لفظ کی حرمت اور تکریم کا محافظ ہے کہ اس کے وجودی مسئلے (EXISTENTIAL PROBLEM) نے اسے استحصالی، جابر اور ظالم معاشرے کے خلاف برسرِ پیکار کیا۔ اس حوالے سے اس بورژوا نظام کے طبقاتی معاشرے میں جو شخص جس طبقے میں اس قائم مقام نظام کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ وہ انقلابی شعور کا حامل ہے کہ جہاں سیّد احمد شہید کی تحریک میں ٹوانے، امپریلسٹوں کے دشمن پر عقب سے وار کر رہے تھے، وہاں پنجاب کے سب سے بڑے زمیندار سردار خاں کھرل نے سامراجی آقاؤں کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہوئے کھلم کھلا باغیوں کی مال و زرمیت ہر ممکن طریقے سے مدد کی ـــــ کہ عظیم اللہ خاں جو انگلستان گیا تو پرنس بن گیا، جب ہندوستان لوٹا تو اپنی گذشتہ زندگی پر لعنت بھیج کر ۱۸۵۷ء کے انقلابیوں میں شامل ہوا۔ اگر اُس وقت کے انقلابی کٹھ ملّا (DOGMATIST) اس کی پرانی زندگی کو عدالتی منصف کی طرح پرکھتے تو اس قبیل کے لوگوں کے جرائم کسی طور قابلِ معافی نہ ہوتے۔

لہٰذا ایسا ہر شخص جو پنڈارہ نہیں، انقلابی شعور کا حامل ٹھہرا، کہ اس کی ـــــ INTRA SUBJECTIVE REALITY کے حوالے سے اس کا یہ فیصلہ اس کی نجات کا باعث بنا۔ اگرچہ میرا لفظ میرے حوالے سے میرا نجات دہندہ ہے لیکن میں خود نجات دہندہ نہیں کہ اس سے میرا علاقہ نہیں کہ گورکی سے لے کر لوہسون تک اور حالی سے لے کر اقبال تک سبھوں نے اپنی اپنی نوع کے نجات دہندوں کی آمد کے لیے راستہ ہی استوار کیا تھا۔ میں اسوۂ حسنہ پر چلنے کی پوری کوشش کرتا ہوں لیکن نبی بننے کی خواہش رکھنے کی کبھی جرات پیدا نہیں ہوئی کہ ایسے

نجات دہندوں کو صرف خدا اپنے بندوں کی وساطت سے یا بندے اپنے خدا کی وساطت سے تخلیق کیا کرتے ہیں۔ میں چاہوں تو بھی ماوزے تنگ تو کیا مولانا ظفر علی خاں تک کے نقش قدم پر بھی قدم بہ قدم نہیں چل سکتا کہ وہ لوگ IDEALLY اپنی تحریروں کو LIVE کرتے تھے۔ میرے لیے یہ آئیڈیل ہے کہ میرے لیے ابھی تک بورژوا معاشرے کے عنایت کردہ تضادات مکمل طور پر میرے لیے حل نہیں ہوئے۔ اسی لیے کوئی ایسی رفاقت یا پارٹی ظہور میں نہیں جو ایسے شخص کی پناہ گاہ بن سکے جس نے اس بورژوا معاشرے سے خود کو کاٹ کر الگ کر لیا ہو۔ یہ کوئی بہانہ سازی نہیں بلکہ ایسے لوگوں کا المیہ ہے جو لوگ مجھ سے یہ امید رکھتے ہیں وہ دراصل اپنے احساس گناہ کو میرے وجود میں مصلوب دیکھنا چاہتے ہیں کہ کٹا ہوا وجود جب تک کسی COMPATIBLE وجود میں TRANSPLANT نہ ہو جائے مر جاتا ہے، اسی لیے ترقی پسند کٹھ ملاؤں (DOGMATISTS) کو، جو کسی عدالتی منصف کی طرح میرے لفظ یا میری ذات کے منصف بن کر میرے گناہوں کو، جو کہ میرے وجودی مسائل (EXISTENTIAL PROBLEMS) کے حوالے سے سرزد ہوتے رہے، اپنی تسلی کے لیے، جرائم میں تبدیل کرنے کا کوئی حق نہیں، ، یوں وہ DOG MA کے حوالے سے مجھ میں ایک پر خلوص، سچے انسان کو منافق بنا دیں گے کہ وہ ان کی رضا کے لیے DOGMA کے مطابق لکھے گا تو سہی، لیکن وہ تحریر BASTARDISED تحریر ہوگی۔ اصل تو وہی ہوگا جو اس کی EXISTENTIAL PROBLEM کے حوالے سے نظر آئے گا۔ ترقی پسند تحریک نے یہی کیا اور اس کے نتائج آج ہمارے سامنے ہیں۔ آج بھی اسی قبیل کے کٹھ ملانٹے گاؤن اور نئی وِگیں پہن کر نئی عدالتیں لگائے بیٹھے ہیں۔ کیا فی الحال اتنا ہی کافی نہیں کہ میں سازشیوں، دشمنوں کے کیمپ میں نہیں کہ میں ڈارک روم میں نہیں، کہ میں زندگی کو رہا ہوں کہ میں بنڈارہ نہیں ورنہ لوہسون تو کٹھ ملاؤں کے حساب سے شنگھائی میں کافر ہی مر گیا تھا۔ کہ مشرف بہ کیمونسٹ پارٹی نہیں ہوا تھا۔ موت سے کچھ عرصہ پہلے جب چینی عوامی انقلاب زور پکڑ رہا تھا تو اس سے پوچھا گیا کہ آپ انقلابیوں کے لیے کیوں نہیں لکھتے؟ اس نے کہا ـــــ اوہ، کوئی انقلاب برپا ہو رہا ہے؟ پوچھا گیا، آپ کیمونسٹ پارٹی کے ممبر کیوں نہیں؟ جواب ملا ـــــ اوہ اس ملک میں کیمونسٹ پارٹی بھی ہے؟ پھر اس سے پوچھا گیا آپ ماؤزے تنگ سے واقف ہیں؟ لوہسون نے ہنس کر پوچھا ـــــ اوہ یہاں کوئی ماؤ بھی ہے ـــــ؟ اس کے باوجود ماؤ فن اور ادب پر لی ثان فورم کی تقریروں

میں بارہا لوہسون کا حوالہ دیتا ہے:

THIS COUPLET FROM A POEM BY LU HSUN SHOULD BE OUR MOTTO.

FIRE BROWED, I COOLY DEFY A THOUSAND POINTING FINGERS,
HEAD BOWED, LIKE A WILLING OX I SERVE THE CHILDREN.

ماوزے تنگ نہ صرف اس نظم کے سمبلزم کو قبول کرتا ہے بلکہ اسے مستحسن بھی تصوّر کرتا ہے:

THE THOUSAND 'POINTING FINGERS' ARE OUR ENEMIES, AND WE WILL NEVER YIELD TO THEM, NO MATTER HOW FEROCIOUS. THE 'CHILDREN' HERE SYMBOLISE THE PROLETARIATE AND MASSES.

ماؤ صحیح مارکسی ہونے کی وجہ سے چیزوں کو حتمی طور پر EMPIRICALLY نہیں دیکھتا بلکہ ESSENSE کو دیکھتا ہے۔ اسی لیے وہ دوستوں اور ہمدردوں کو دشمنوں کے کیمپ میں نہیں دھکیل دیتا۔ اسی لیے دشمنوں، پنڈاروں کے علاوہ باقی تمام لوگ اس کے ساتھی بن جاتے ہیں کہ ESSENSE میں کیمونسٹ ماؤ اور غیر کیمونسٹ لوہسون میں کوئی فرق نہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ نئے کٹھ ملّا (DOGMATISTS) کا نیم ہضم شدہ مارکسزم اپنی روایتی ضد، ہٹ دھرمی اور احساس برتری (کہ اپنے تئیں لفظوں کے حاکم ہیں اور اس قبیل کے حاکموں کے لیے حرمت یا تکریم، اکثر اضافی اقدار ہوا کرتی ہیں) کے باعث کہیں ایک بار پھر ایک نوزائیدہ شعور کو ضیق النفسی میں مبتلا کرکے مار نہ دے۔ میں ان کے کانوں سے معدوم ہوتی لینن کی آواز کو فیڈ اِن کرتا ہوں۔

"IT WILL BE A FREE LITERATURE, BECAUSE THE IDEDA OF SOCIALISM AND SYMPATHY WITH THE WORKING PEOPLE, AND NOT GREED OR CAREERISM, WILL BRING OVER NEW PROCESS TO ITS RANKS.

يوسف كامران

# داستانِ انور سجّاد

انور سجّاد آسمانِ ادب پر دھنک کی ایک شکل ہے کہ اس کے سات رنگوں میں شاعری، مصوّری، افسانہ نگاری، ڈرامہ نویسی، اداکاری، تنقید اور رقص کا حسین امتزاج ہے۔ بغور دیکھیے تو یہ سب کچھ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں جو اپنے بدلے ہوئے چلن اور نت نئے انداز میں سامنے آتی ہیں۔

سات رنگوں سے دھنک بنی ہے، پر ساتوں کا ایک ہی رنگ

انور سجاد کی تخلیقی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو اس کی VERSATILE شخصیت میں موجزن بے انت صلاحیتیں ایک ایک کرکے یوں سامنے آتی ہیں کہ فن کے ہر شعبے میں اُس کی کارکردگیوں کی ایک لمبی داستان بنتی ہے۔ فن کا ہر مظہر اس کی فطری توانائی سے عبارت ہے، اُس میں انرجی کا عنصر اس قدر توانا اور بے کراں ہے کہ وہ گوشت پوست کے ایک عام انسان کی بجائے قوت اور توانائی کا ایک اُبلتا ہوا لاوا نظر آتا ہے۔ تخلیق کا کوئی وظیفہ ایسا نہیں جس کی مالا انور سجاد نے نہ جپی ہو۔ اُس کے ہاں مواد کی فراوانی شاید اس قدر ہے کہ وہ اس کے استعمال کے لیے مختلف حوالے تلاش کرتا ہے اور جب کسی ایک صنف میں تکمیل کا احساس نہیں ہوتا تو اظہار ذات کی ہر اُس ممکن صورت کو اپناتا ہے جو اس کے احساسات کا سانچہ بن سکے۔ یہ سب کچھ درحقیقت اپنی ذات کو EXPLORE کرنے اور کائناتی تناظر میں اپنے آپ کو سمجھنے کی کارروائیاں ہیں۔ ان تمام سرگرمیوں میں جھلکتا ہوا بھرپور اعتماد، مستقل جوش اور بے پناہ ولولہ اُس کے عزم و ہمّت کی دلیل ہے۔ آپ اُسے کوئی منصوبہ بتائیے یا اس سے کسی منصوبے میں شرکت کی حامی بھروایئے یہ اپنی نظریاتی اور جذباتی وابستگیوں میں اس قدر جوش

کا مظاہرہ کرے گا کہ اپنے نچلے ہونٹ پر زبان پھیرتے ہوئے اُس کی چمکتی ہوئی موٹی موٹی آنکھیں اور بھی بڑی ہو جائیں گی پھر اُس کے گریبان سے جھانکتا ہوا سینہ تانبے کی طرح سُرخ ہو جاتا ہے اور وہ سر کو جھٹک کر فرطِ جذبات سے یوں مٹھیاں بھینچ لیتا ہے کہ جیسے اپنے آپے سے باہر ہو جائے گا۔ اُس کے پھرتیلے جسم کا رُواں رُواں کانپنے لگتا ہے۔ ایک پل چین نہیں پڑتا اور یوں اس میں چھپا ہوا ENTHUSIASM کبھی کبھی ANXIETY کی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔

انور سجاد کو بیشتر لوگ ایک نامور افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ بعض بزرگانِ ادب کا خیال تو یہ ہے کہ منٹو کی روایت کے بعد جب اردو افسانہ انور سجاد تک پہنچا تو اُس پر جدید نفسیاتی تحریکوں کے علاوہ علامت پسندی کی تحریک کا گہرا اثر تھا۔ علامت نگاری کے حوالے سے افسانوی ادب میں ایک افراتفری پھیل گئی، کہانی پن کی بجائے علمیت کا رجحان بڑھتا گیا اور یوں علامت ابلاغ کا ذریعہ بننے کی بجائے معنی میں اُلجھن اور پیچیدگی پیدا کرنے کا سبب بن گئی۔ یہ احساس فی نفسہٖ ایک کج فہمی پر مبنی ہے۔ انور سجاد نے اپنی افسانوی زندگی کا سفر پُرانے افسانہ نگاروں کو راہنما بنا کر نہیں بلکہ اپنی منفرد افتادِ طبع کے حوالے سے کیا ہے، اُس نے ماضی پرستی کی بجائے اپنے عہد کے شعور کو تاریخ کے مختلف تجربوں کے پس منظر میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور یوں عصری تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے فنکارانہ اظہار کا ایک نیا اور اچھوتا انداز اختیار کیا ہے۔

اُس نے سماجی زندگی کے نئے تغیرات کو زندہ شعور کی راہنمائی میں ہیئت اور مواد کے حوالے سے جو جدت بخشی ہے وہ حقیقت نگاری کا ایک نیا اسٹائل ہے اور چیزوں کو فوٹوگرافک ویژن سے دیکھنے کی بجائے اپنے باطنی ویژن سے دیکھنے کا عمل ـــــ یہ ایک سمبلسٹ افسانہ نگار ہوتے ہوئے علامت کے ذریعے معنی اور حقیقت کا ادراک کرتا ہے۔

بہت لوگوں کے لیے علامت نگاری اگر ہماری تہذیبی زندگی اور اپنی تاریخ سے نکلی ہو تو قابلِ اعتراض نہیں ہوتی۔ اُن کے نزدیک کسی اور تہذیب سے استعارہ لے کر مفہوم ادا کرنے کا عمل ایک قابلِ اعتراض فعل ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات مسائل کو وسیع تناظر میں دیکھنے کا رویہ انسان کے اندازِ نظر کو بدل دیتا ہے۔ بنیادی

بات کسی مسئلے کی اہمیت کو جانتے ہوئے اپنے رویے اور اظہار کی شکلیں متعین کرنا ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انور سجاد کا افسانہ پلاٹ اور وقت کی منطق کے چوکھٹے میں قید نہیں ہوتا اور نہ ہی غیر ضروری PRETENSIONS کا حامل ہوتا ہے ۔ انور سجاد کے ہاں ملکی اور بین الاقوامی تناظر میں اور معاشرتی صورت حال کو دیکھنے کا اپنا انداز ہے اور اس کی PERSUANCE میں وہ کہانی لکھتا ہے ـــــ

میں جانتا ہوں کہ انور سجاد کے لیے تشکیک کا دَور اس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ DISILLUSIONED ہو ۔ لاقانونیت کے معاشروں میں جب بیشتر قومیں جبر و تشدد کے ذریعے زندگی کے تخلیقی عمل کے خلاف ایک سازش میں مصروف ہوں تو انسان بعض اوقات اپنے وجود کی حقیقتوں سے مایوس ہوجاتا ہے ۔ کچھ یہی کیفیت انور سجاد کی بھی ہے وہ جس ذہنی افق کا نمائندہ ہے جبر و تشدد کی ہر صورت حال اس کے اندر کرب پیدا کرتی ہے ۔ یہ بلند بانگ دعوے کرنے والے انقلابیوں میں سے تو نہیں لیکن اس کے سائنسی انداز فکر نے عہد حاضر کے تضادات کو بھرپور طور پر محسوس کیا ہے ۔ ان تضادات کو محض تعصب کی حدوں میں رہ کر نہیں دیکھتا بلکہ بین الاقوامی تناظر میں ان کا جائزہ لیتا ہے ۔ وہ معاشرے اور ماحول کی بہتری میں انسانی زندگی کے بناؤ سنگھار کے خواب دیکھتا ہے کہ انسانی برادری کو غلاظتوں سے پاک کیا جاسکے ۔ انسانی آزادی کا عَلم بردار ہوتے ہوئے اُس نے ہمیشہ اندرون ملک اور بین الاقوامی سطح پر فاشزم کو بے نقاب کرنے کی کوششیں کی ہیں ۔ اور یوں تیسری دنیا کے تناظر میں انسانی آزادی پر زور دیا ہے ۔

اگر آپ خطۂ ارض پر اپنی جڑیں تلاش کرتے ہوئے تیسری دنیا کے تاریک براعظموں سے آنے والی صدائیں سن سکیں تو پھر PREMISES کا فرق جان کر آپ انور سجاد کے جذباتی INVOLVEMENT اور PARTICIPATION کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ پائیں گے ۔

رہی بات علامت نگاری کی تو پھر مخصوص تجربہ اپنے اظہار کا اسلوب بھی ساتھ لے کر آتا ہے ۔ انور سجاد کے ہاں علامت کا استعمال باہر سے برآمد کی ہوئی شے نہیں بلکہ پورا افسانہ اپنے اظہار کے حوالے سے ایک بھرپور IMAGE بنتا ہے ۔ فرد کے مسائل اور اُس کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کا تجزیہ کرتے ہوئے اُس نے اجتماعی طرزِ احساس کو اپنے انفرادی اسلوب کے ذریعے بیان کیا ہے ۔ یوں اس کی ہر علامت میں ایک گہری

معنویت پائی جاتی ہے۔ یہ اپنے آپ پر مصنوعی واردات طاری کرکے کربِ ذات کا ڈھونگ رچانے والوں میں سے نہیں۔ البتہ جہاں کہیں اُس نے شعوری رَو کو تکنیک کے طور پر استعمال کیا ہے وہاں ذہنی تلازمہ اشیا کی پیچھے کی طرف جھانک کر دیکھتے ہوئے مختلف جہتوں میں سفر کرنے لگتا ہے اور یوں اُس کے افسانوں میں ایک قسم کی طلسماتی فضا پیدا ہوجاتی ہے جو بعض اوقات ایک تناؤ (TENSION) کی حالت چھوڑ جاتی ہے۔ اسی باعث انور سجاد کے افسانوں کو سمجھنے کے لیے ایک نئے نقطۂ نظر کی ضرورت ہے۔ ایک ایسی وژن کی کہ جس کے توسط سے علامت قابلِ فہم بن سکے اور آپ حقیقت کا ادراک کرپائیں۔

افسانہ نگاری کے علاوہ ہر شعبۂ فن میں اس کی انتہائی مختلف دلچسپیوں کو دیکھ کر چند دوست انور سجاد کو JACK OF ALL TRADES بھی کہتے ہیں۔ میری رائے میں یہ محض غلط فہمی ہے کہ انور سجاد بہرحال جیک سے بہت آگے کی چیز ہے۔ یہ انجمن سازی کے مسائل ہوں کہ ادیبوں کی ٹریڈ یونین اِزم، مجلسی زندگی کے ہنگامے ہوں کہ یاروں کی محفل، جلسے جلوس ہوں کہ ثقافتی پروگرام، ٹی وی ریڈیو کی مصروفیات ہوں کہ مریضوں کی دیکھ بھال، میں نے ان سب سرگرمیوں میں انور سجاد کو ہمیشہ اپنے جسم اور اپنی رُوح کے ساتھ INVOLVED پایا ہے۔ میری رائے میں اس بے پناہ لگن کے ساتھ کسی کام میں اسقدر جانفشانی اور تندہی کا مظاہرہ بہت کم لوگوں میں دیکھا جاتا ہے۔ یہ کسی جلسے میں ہوگا تو جوش اور ولولے کی یہ کیفیت ہوگی کہ جسم کا رُواں رُواں کانپ رہا ہے۔ افسانہ ڈرامہ لکھنے کی مصروفیت ہوگی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ غرق ہوکر لکھ رہا ہے۔ کسی مریض کو دیکھنے میں مصروف ہوگا تو تمام تر توجہ اس کو شفا دلانے پر مرکوز ہوگی۔ ٹی وی اسٹیج پر کوئی کردار کررہا ہوگا تو اس طرح ڈوب کر کہ جوشِ جذبات میں اپنے آپ کو بھول جائے جیسے یہ کردار اس کی شخصیت کا پرتو ہو یا وہ کردار کو اپنی شخصیت کے رنگ میں رنگ لے، اکثر جب یہ اپنا رول کرکے اسٹیج سے اترتا ہے تو حرارت سے پھنک رہا ہوتا ہے پھر حقیقی مسرّت اُس کے چہرے اور آنکھوں سے یوں نکلتی ہے جیسے کوئی قارون کا خزانہ مِل جائے۔

ادبی اور ثقافتی محاذ پر بھی انور سجاد کی سرگرمیاں اس کی انتظامی صلاحیتوں اور

منفرد وژن کی غمازی کرتی ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں جب انور سجاد حلقۂ ارباب ذوق لاہور شاخ کا سکریٹری منتخب ہوا تو یہ انتخاب بذات خود ایک نئی جمالیاتی بصیرت کا نقیب بنا۔ اس سال قومی اور بین الاقوامی مسائل جو زندگی کی ہر کارروائی کو متاثر کرتے ہیں براہ راست ایک غالب رجحان کے طور پر حلقے کی مباحث کا موضوع بنے۔ ادب میں محض جمال پرستی کو بانجھ پن کی علامت سمجھا گیا اور وہ لوگ جو حلقے کو صرف ادب اور جمالیات کے مباحث کا مرکز سمجھتے تھے اسی صورت حال میں بحران کا شکار ہو گئے اور یوں بھی مارشل لا حکومت کے نظریات سے اختلافی امور کا تذکرہ کرنا ناممکنات میں سے تھا لہٰذا انور سجاد کی سکریٹری شپ میں حلقے میں جو استقامت اور جرات کارفرما تھی اس کی معنویت آمرانہ تشدد کی فضا ہی میں پہچانی جا سکتی ہے۔ اس صورت حال میں حلقے نے نہ صرف یہ کہ ایک سنجیدہ غور و فکر کی فضا پیدا کی جس میں حقائق کا مطالعہ اور تجزیہ منطق اور معنویت کی روشنی میں کیا جانے لگا بلکہ اپنے ناتواں ذرائع کے باوصف ایک رزمیہ کارروائی بھی کی کہ ایسے "مختصر اور پرمعنی رزمیے بڑی دل جمعی کا سامان ہوتے ہیں۔"

اسی طور ۱۹۸۲ء میں انور سجاد جب پاکستان آرٹس کونسل کا چیئرمین مقرر ہوا تو اُس نے اپنی گورننگ کونسل اور فن کے ہر شعبہ سے متعلق نامور شخصیتوں سے صلاح مشورے کے بعد فائن آرٹس کی ترویج و ترقی کے لیے ایک بھرپور لائحۂ عمل بھی مرتب کیا۔ پاکستان آرٹسٹس ایکویٹی کی بنیاد رکھ کر اُس کے انتظامی امور میں بھی انور سجاد نے جس حسن ترتیب کا مظاہرا کیا اُسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ انور سجاد کی یہ DYNAMIC شخصیت اقتدار پر قابض حضرات کی خوشنودی کا باعث نہ بن سکی اور یہ پھر اپنی پہلی ڈگر پہ آ گیا کہ اُس کی پہلی اور آخری کومٹمنٹ فن کی خدمت ہے۔

ادیبوں اور فنکاروں کی برادری کا یہ خاصہ ہے کہ جو خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ ـــــ لہٰذا بعض ادیب کسی دوسرے ادیب میں ملامت کا پہلو تلاش کرتے ہوئے گھٹیا قسم کی الزام تراشیوں پر اتر آتے ہیں ــ انور سجاد بھی اس قسم کے دشمنوں سے محفوظ نہیں، اُس نے اپنی محنت اور صلاحیت کے بل بوتے پر جو مقام حاصل کیا ہے اُس کے بارے میں چند معترضین کا اس جیسا زندگی کا آرزومند ہونا ایک

بجا خواہش سہی، لیکن ایسے لوگ جب خود میں صلاحیتوں کا فقدان پاتے ہیں تو اپنی محرومیوں کو فلسفۂ حیات بناکر چند باتیں ہضم نہیں کر پاتے اور قیاس آرائیوں پر اتر آتے ہیں۔ لاہور کے ادبی حلقوں میں جب کبھی انور سجاد پر اس قسم کی گرما گرم بحث ہوتی ہے تو یہ اس کا بُرا ماننے کی بجائے اُس پر خوش ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ انور سجاد کے بارے میں ان ادبی بالشتیوں کی رائے کیا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی مرض ہے۔ دوستوں میں یہ روش کچھ نئی بھی نہیں۔ لہٰذا میں اس کی تفصیل میں جائے بغیر اتنا عرض کردوں کہ میں نے انور سجاد کو اس قسم کے فقرے بازوں اور الزام تراشوں سے نہ صرف ہمیشہ بردباری اور خندہ پیشانی سے ملتے دیکھا ہے بلکہ اکثر باتوں کے اعتراف کے بعد اُن کا احترام بھی کرتے دیکھا ہے۔ بنیادی طور پر یہ HUMANIST اور کھلے دل کا انسان ہے اور فن کے باب میں غور و فکر کرنے والے دوستوں کے درمیان افہام و تفہیم کی فضا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر کبھی غلط فہمیوں کی بنیاد پر کچھ رنجشیں بھی ہوئیں تو انور سجاد نے یا تو ہمیشہ باہمی گفتگو کے ذریعے اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی یا پھر کھل کر صورت حال کا سامنا کیا۔ غیبت اور پیٹھ پیچھے دشمنی کو کبھی اپنا شعار نہیں بنایا کہ یہ تصادم کی صورت حال میں جد و جہد کا قائل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میدان میں ناکامی اور کامیابی دونوں سے برابر کا واسطہ ہے لیکن انور سجاد کے لیے نہ تو ناکامی باعث ندامت ہے اور نہ کامیابی باعثِ فخر کہ یہ عمل اُس کے لیے اعزاز یا آزار نہیں بلکہ زادِ راہ ہے۔

انور سجاد ایک فن کار ہی نہیں ایک اعلا پائے کا ڈاکٹر بھی ہے۔ ادب و فن کچھ واحد ذریعہ عزّت یوں نہیں کہ پیشہ آبا بھی ڈاکٹری ہے۔ ان کے والد دلاور علی شاہ کا شمار شہر کے نامور ڈاکٹروں میں ہوتا ہے، ڈاکٹر دلاور علی شاہ کچھ ایسے صاحب دولت تو نہیں لیکن نہایت دین دار اور درویش منش انسان ہوتے ہوئے بے بہا خوبیوں کے مالک ہیں۔ انھوں نے جس لگن اور جانفشانی سے انور سجاد کو ڈاکٹر بنانے پر مسلسل توجہ دی اُس میں پیش آنے والی شفقتوں اور سختیوں کی داستان کچھ انور سجاد ہی جانتا ہے۔

ڈاکٹر دلاور علی شاہ اپنی پریکٹس اندرون شہر علاقہ چونامنڈی میں کرتے ہیں۔

شہر بھر کے لوگوں میں کچھ ایسے مقبول رہے ہیں کہ دکان پر صبح و شام مریضوں کا تانتا بندھا رہتا ہے ۔ انور سجاد نے جب ان کی جگہ کام سنبھالا تو لوگوں کو ان کے والد محترم پر جو ایک والہانہ اعتقاد تھا اُس کا کچھ ہی حصّہ بڑی کوشش سے حاصل کر سکا اور اب رفتہ رفتہ یہ تاثر بڑھ رہا ہے کہ ڈاکٹر دلاور علی شاہ کے ہاتھ میں جو شفا ہے وہ اب روایتاً ڈاکٹر انور سجاد کے ہاتھ منتقل ہو چکی ہے ۔

انور سجاد نے اپنی میڈیکل پریکٹس میں جو مقام پیدا کیا ہے اُس میں اُس کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے علاوہ اُس کے حسن سلوک اور تعلق خاطر کا بڑا ہاتھ ہے ۔ یہ اپنے مریضوں کا جس توجہ اور لگن سے علاج کرتا ہے اِس قسم کی ذاتی INVOLVEMENT اور جنون کی حد تک CONCERED محسوس کرنے کا رویہ بہت کم ڈاکٹروں میں دیکھا گیا ہے ۔

بچّے ، بوڑھے ، جوان ، مرد و زن مریضوں سے اُس کی وابستگیاں کچھ ایسی ہیں کہ ہر کوئی ڈاکٹر سے زیادہ اُسے اپنا دوست جان کر علاج کراتا ہے ۔ علاج معالجے کے علاوہ نفسیاتی طور پر کسی کے مرض کو جاننا اور پھر اس حوالے سے اس کا علاج کرنا بذات خود ایک فن ہے اور انور سجاد اس فن میں ماہر ہی نہیں اپنے اس رویے کی وجہ سے مقبول بھی ہے ۔ دن بھر اپنی دیگر فنی سرگرمیوں اور گوناگوں مصروفیات کے باوجود بارہا دیکھا گیا ہے کہ جب اور جہاں کہیں کلینک کھلنے کا وقت ہوا ڈاکٹر سب کچھ چھوڑ چھاڑ اپنی ہٹی سجانے کو بھاگ کھڑا ہوا ۔ کلینک میں آنے والے مریضوں کا علاج تو اپنی جگہ بلکہ کلینک سے باہر بھی جہاں کہیں کسی دوست نے ناسازیِ طبیعت کا تذکرہ کیا ڈاکٹر نے اسی وقت کسی چٹ پر دوائی لکھ دی اور مناسب ہدایات سے کچھ اس محبت اور خلوص سے نوازا کہ آدھا مرض تو وہیں جاتا رہا ۔ یہ ٹی وی ، ریڈیو یا کسی ادبی ثقافتی مجلس میں دوستوں کا جم غفیر ہو کہ ٹی ہاؤس میں ادیبوں کی محفل ، دوستوں کے علاج پر اُس کی خصوصی توجہ ہوتی ہے کہ دوستوں کی خدمت کرنا اس کا مسلکِ حیات ہے کوئی ذریعہ معاش نہیں ۔ میں نے ایک بار تذکراً کہہ دیا کہ ڈاکٹر تم اگر چونامنڈی کے اُس کلینک سے اٹھ کر اگر گلبرگ جیسی پوش آبادی میں ایک چھوٹا سا کلینک بھی کھول لو تو کئی گنا زیادہ کمائی کرو ۔ انور سجاد کی معروف شخصیت اور ایسی آبادیوں میں ٹی وی آرٹسٹوں کی CRAZE کے حوالے سے سب لوگ جانتے ہیں کہ میں نے کوئی غلط مشورہ نہیں دیا تھا لیکن میری یہ بات سنتے ہی ڈاکٹر نے جذباتی

سا ہوکر آنکھیں لال کریں " میں میاں اپنے لوگوں کی خدمت کے لیے بیٹھا ہوں ۔ محض کاروباری نقطۂ نظر سے نہیں ۔ مجھ پر گلبرگ ایسی آبادیوں کے متمول اور نو دولتیے خاندانوں سے زیادہ میرے اُن لوگوں کا حق ہے جن میں میں پلا بڑھا ہوں اور سچی بات تو یہ ہے کہ میرے والد نے مجھے انھیں لوگوں کے لیے ڈاکٹر بنایا ہے ۔"

اس قابل قدر جذبہ کے اظہار پر مجھے حیرت تو ہوئی لیکن میرے دل میں انور سجاد کی عزّت دو نی ہوگئی کہ وہ واقعی انسان دوست شخص ہے ۔ بارہا یہ ہوا کہ ڈاکٹر کو اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود جب کبھی کسی دوست کے علیل ہونے کی خبر ملی اور علاج کے سلسلہ میں ڈاکٹر کی ضرورت محسوس کی گئی تو ڈاکٹر اپنی تمام تر عدیم الفرصتی کے باوجود جھٹ سے گاڑی میں بیٹھا دوست کے گھر گیا دوا دی اور تسلّی بخش جملوں کی تھپکیاں دیتا ہوا کسی اور اہم کام کی جانب بھاگ کھڑا ہوا ۔

○

# انور سجّاد کا نامکمل ایکس رے

## ایم۔ شریف

"مختصر کہانی" لکھنے والے انور سجاد کی اپنی کہانی بہت طویل ہے۔ اگر میں اُس کی زندگی کو اس خاکے میں سمیٹنا چاہوں تو خود میرے لیے یہ ایک مشکل مرحلہ ہوگا۔

فنونِ لطیفہ کے حوالے سے انور سجاد فنون کے تمام شعبوں پر یکساں طور پر بھاری ہے اور پھر میرا مسئلہ یہ ہے بھی نہیں کہ میں نقاد بن کر اُس کے طے شدہ مراحل پر نظر ڈالوں۔ انور سجاد نے بے پناہ لکھا ہے، طویل و مختصر کہانیوں کی صورت میں ــ ریڈیو ٹیلی ویژن پر مکالموں کی صورت میں ــــ قید و آزاد شعری صورت میں ــــ مضامین و تقریری صورتوں میں ــــ پھر ان سارے حوالوں سے ان پر بے پناہ بحثیں ہوئی ہیں ــــ بحثیں کیا مناظرے ہوئے ہیں۔ انور کے اپنے خاص ادبی اسٹائل رکھنے پر تو اس قدر شورش تھی کہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس خطۂ ارض کے تمام مسائل طے کر لیے گئے ہیں اگر کوئی مسئلہ رہ گیا ہے تو بس ــــ 'انور سجاد اور اس کا فن'۔

انور سجاد قاری سے رابطہ نہیں کر پاتا ــــ یہ شور بھی سننے میں آیا، 'یہ شور و غوغا بھی وہی مچاتے تھے کہ جنھیں "بات" صاف سمجھ میں آرہی تھی ــــ صرف عام سطح کا قاری ششدر تھا، اُسے ہونا بھی چاہیے کہ عام سطح کے قاری اور انور سجاد میں بُعد محض اسٹائل یا جدیدیت استعاراتی خلک الاخلاک کا نہیں بلکہ صدیوں کا ہے۔ یہ بُعد بالکل ہماری سوسائٹی کے شہر اور دیہات والا ہے کہ جہاں شہر میں زندگی سائنس کے زیر اثر ضربیں کھاتی ہوئی تیزی سے بڑھ رہی ہے مگر دوسری جانب کسان آج بھی اپنی بھاری بھرکم گڈ پر بیٹھا رینگ رہا ہے۔

انور سجاد نے معمولات کو غیر معمولی طور پر دیکھنے کی بنا ڈالی ہے اور جو لوگ

شروعات میں اپنے ویژن کی ناپختگی کے باعث، یا یوں کہہ لیجیے کہ لوگ ادب کو بھی ناپ پر بنا ہوا جوتا سمجھتے تھے کہ اُن کے مزاج پر پورا اُترے، معروضی صورت حال سے بے خبر افراد کا یہ ٹولہ یہ بھی مطالبہ کرنے لگا کہ "انور اپنے کام کو 'تھیورائز' کردے" کون سمجھائے کہ بھائی یہ کام نقادوں کا ہے کہ وہ کسی ادیب کے کیے کام کو گزوں، پیمانوں، حرارتوں کے حوالے سے پیا کرتے ہیں یا تعین کرتے ہیں کہ بجائے ادیب خود پہلے فارمولا شائع کرے پھر اُس ناپ تول پر کرب بیانی کرے سو اس قسم کی بحثیں ہر عہد میں اُس کے عصریے کیا کرتے ہیں اور یہ گھپلا جبھی ہوتا ہے جب کہ رجعت پسند ادب و فن کو بھی ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ وہی بات کہ معمولات کو غیر معمولی طور پر دیکھنے سے رویے میں جو انقلابی تبدیلی آتی ہے۔ وہ انور کے ہاں حرارت کے طور پر موجود ہے۔

ایک بات جو مجھے زیادہ پریشان کر رہی ہے، بلکہ حسد کی حد تک لے گئی ہے کہ انور سجاد کے عروج کا سن کون سا منتخب کروں، ایسا لگتا ہے کہ اُس نے جو پہلا لفظ لکھا تھا یا پہلی تصویر بنائی تھی۔ عروج کی کہانی وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ میرے سامنے سے آج تک انور کی کوئی ناپختہ تحریری تصویر نہیں گزری۔ یہاں میں اسٹائل سے متعلق بات نہیں کر رہا بلکہ ادب کے حوالے سے ادیب کی 'کومٹ منٹ' انور سجاد کے عہد نامے میں کہیں بھی بھول یا کتابت کی غلطی موجود نہیں ہے۔

حالانکہ میں نے شروع میں اقرار بھی کیا ہے کہ میں ادب کے حوالے سے انور سجاد کو نہیں چھوونگا مگر مجبوری آڑے آتی ہے کہ اِس کے بنا بات آگے نہیں چل رہی اور اگر میں یہ چاہوں کہ فنون لطیفہ سے دست کش ہو کے انور پر بطور ڈاکٹر کے خاکا لکھ دوں تو بھی ممکنات میں سے ہے کہ ہر روز اُس کی ذات پر سے ایک نیا پردہ اٹھتا ہے۔ اِس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انور کوئی ماورائی الفطرت شے ہے ــــ نہیں، بلکہ وہ ایک عام آدمی ہے۔ عام لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے والا۔ انور عام لوگوں میں بطور کیمرہ شریک نہیں ہوتا بلکہ خود اُن میں سے ہے۔ اُسے گھر میں جدید قسم کی تمام سہولتیں میسّر ہیں جو کسی بھی خالی الذہن کا رشتہ کبھی بھی "باہر سے" "اپنوں سے" کاٹ سکتی ہیں ــــ یہ سہولتیں اُس کا کرب ہیں کہ وہ مثبت سے منفی کی خبر دیتا ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں اتنا توانا ذہن رکھنے والا فنکار آج تک نہیں دیکھا جو نہ تو تھکتا ہے اور نہ ہی اُکتا[1] ہے۔ انور میں بے پناہ قوت ہے۔ یہ قوت صداقت اور لگن کے زیر اثر ہے۔ اُس کے ہم عصر اُسے شہاب ثاقب سمجھتے ہیں۔ انتظار کر رہے ہیں کہ اِس افسانے کے بعد، اس کھیل کے بعد، اس تنقیدی مضمون کے بعد انور سجاد کی توڑ پھوڑ ہوجائے گی ـــــ مگر نہیں اُس کے اندر تو جیسے قوت جنم دینے کا خود کار نظام موجود ہے، وہ تو پھر اُسی قدر "ہرا بھرا" اور توانا نظر آتا ہے۔ یہ انور سجاد کی ہمت ہے۔ اُس کی جگہ اگر میں ہوتا تو کب کا اس شورش سے گھبرا کر تخلیق کار ہونے کی بجائے محض مترجم ہو کر معاشی آسودگی سے ہم کنار ہوتا۔ شہر میں کوئی ڈپارٹمنٹل اسٹور کھولتا، دولت کماتا۔ مسکین ادیبوں کی طرح دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہونے دینے والی امداد کرتا پھر نو دولتیوں کی طرح شہر میں تیز تیز گاڑی چلاتا۔ تیز چیں چیں کرتی بریکیں لگا کر غربا و مساکین کو دکھاتا کہ دیکھو اے اہل شہر میں نو دولتیا ہوں میرے پاس دولت کے استعمال کا کوئی طریقہ ہی نہیں۔ مگر صاحبو کیا کیجیے انور سجاد اس سارے معرکے سے بچ نکلا ہے ـــــ اور پاک دامن ہے۔ خود میں بھی انور سجاد کے ہاتھ مشرف بہ سوشلزم ہوا کہ مجھے بھی ایسے انسان کی تلاش تھی جو گھِسی پٹی، متروک، ستے آور ٹرمینالوجی سے گریز کرتا ہو، محض نتائج پر بحث نہ کرتا ہو بلکہ اسباب پر نظر ڈالتا ہو۔

اصل میں انور سجاد میں موجود کرب وہ کتھارسس ہے جو فنونِ لطیفہ کے تمام شعبے مِل کر بھی نہیں کر پائے۔ جب تک "کرب و بلا" کا سلسلہ جاری ہے۔ سرد ہو جانے کا مطلب "سمجھوتہ" ہے۔ جو انور نے آج تک نہیں کیا۔ لہٰذا اُس کی تمام زندگی سیماب کیفیت ہے وہ ہمیشہ جنگی صورت حال میں رہتا ہے، گھر سے صبح سویرے ایسے نکل کھڑا ہوتا ہے جیسے شہر کی کنجی انور کے پاس ہے اور اسے ہی کسی اور کو جا کر عطا کرنی ہے۔ حتّٰی کہ اپنی گاڑی شہر کے دشوار گزار راستوں پر اس قدر تیز دوڑاتا ہے، جیسے حادثہ کرنے چلا ہو اور پھر یہ بھی نہیں کہ وہ کوئی غیر محتاط ڈرائیور ہے ـــــ عرض کیا ہے نا کہ کتھارسس کرب، سوچ، اسباب، اسباب کے حوالوں سے نتائج۔ یہ بے چینی اُسے معاشرتی ناانصافیوں نے بخشی ہے۔

---

[1] اُکتا، پنجابی میں اُکتا جانے کو کہتے ہیں۔

اس لیے تو اس مرتبہ انور نے اپنی نئی کہانی "یوسف کھوہ" کو باقاعدہ طور پر ختم شد نہیں کیا بلکہ حلقہ ارباب ذوق میں کہا کہ یوسف کھوہ کی کہانی تب تک ختم نہیں ہوگی جب تک معاشرتی اونچ نیچ قائم ہے۔ یہ کہانی حلقے کے اندر اور باہر جاری و ساری ہے۔ یہ کہانی ہم سب لوگ انور کے بعد سے شروع کریں گے۔ انور سجاد کا کہنا ہے کہ کہانیاں پرانی ہیں — صرف ادیب نیا ہوتا ہے، نکتہ نظر نیا ہوتا ہے —

انور سجاد نے جبکہ وہ ابھی میڈیکل کے طالب علم تھے اپنی مصوری کی نمائش کرکے عام لوگوں کو عموماً اور دانشوروں، مصوروں کو خصوصاً چونکا دیا۔ اُس نے غالباً پہلی مرتبہ سائنس اور آرٹس کو یکجا کرنے کی کوشش کی تھی کہ جس میں سرنج کو بھی بطور برش استعمال کیا گیا تھا۔ نت نئے تجربے کرنا اس کی سرشت میں داخل ہے کہ وہ کہتا ہے "فنون لطیفہ تمام کے تمام تجربے کے محتاج ہیں، جب اِن میں تجربے ختم ہوجاتے ہیں تو جمود، جمود کا شور بلند ہوتا ہے۔ تو جمود حالات اور طبقات میں نہیں ہوتا، محض فنکار کے ہاں ہوتا ہے، کہ وہی تو قوم کی حرارت کا پیمانہ ہوتا ہے۔"

انور سجاد نے یہ تصاویر اپنے گھر کے غسل خانے میں مقید ہوکر تخلیق کی تھیں کیونکہ انور سجاد کے والد صوفی منش بزرگ ہیں اُن کی نظر اگر برخردار کے ان لچھنوں پر پڑجاتی تو شاید نان ونفقہ کی تنگی ہوجاتی لہذا وہ غسل خانے میں آزادانہ سگرٹ نوشی کرتا اور تخلیقی عمل جاری رکھتا۔

ایک اور عذاب بھی ہے جسے بیان کرکے آگے چلنا مناسب ہوگا کہ انور کے والد اب بوڑھے ہوکر کلینک کی سرگرمیوں سے ریٹائرڈ ہوگئے ہیں۔ آبائی کلینک کو چلانا بھی انور سجاد کی دن بھر کی سرگرمیوں میں سے ایک ہے۔ انور نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اُن کا چھوٹا بھائی تنویر (جو آج کل امریکہ میں ہے) بھی ڈاکٹر آف میڈیسن بن کر اس کا دست و بازو بنے۔ مگر میرے اندازے کے مطابق تنویر زیادہ بالغ نظر ثابت ہوا وہ انجنیئر بن کر خود کو گھریلو دوزخ سے آزاد کراگیا، جہاں آدمی کا محض معاشی استحصال ہی نہیں ہوتا بلکہ نفسیاتی استحصال بھی ہوتا ہے اور خصوصاً ہمارے جیسے معاشروں میں جہاں "مشترکہ خاندانی سسٹم" ہوتا ہے، جس میں ایک فرد کماتا ہے بقیہ اُسے چاٹتے ہیں۔ انور سجاد بھی اِس سے مبرّا نہیں اور میں یہ سوچتا رہتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ اُس کا بھائی روبی اُس کی معاشی سازش کا شکار ہوجاتا اور انور سجاد کو وقت کی تھوڑی بہت سہولت مل جاتی تو پھر موجودہ انور سجاد اور

کیا ہوتا ؛ کیوں کہ اہل وطن تو پہلے ہی معروف ترین انور سجاد سے پریشان ہیں ۔ انور سجاد بیگ وقت ہمہ وقتی ڈاکٹر آف میڈیسن ، ہمہ وقتی ادیب ، اداکار ، ڈرامہ نویس، ہدایت کار، رقاص اور نقاد ہے ۔۔۔

شاید آپ لوگ بھی یہ بات سمجھتے ہوں کہ برصغیر پاک و ہند کے مخصوص معاشرتی ڈھانچے کے باعث فن کار کی کوئی زیادہ عزت نہیں ۔۔۔ بلکہ ہے ہی نہیں، انور سجاد کو یہ غم بھی ہے اور یہ غم اگر کسی کو نہیں تھا تو صرف ساتھی فن کاروں ہی کو نہیں تھا ۔۔۔

فن کار کی معاشرے میں عزت کی بحالی کا کام محض اپیلوں، خالی خولی تقریروں، چھوٹی موٹی بھوک ہڑتالوں یا ماتمی کالموں کے ذریعے حل ہونا مشکل تھا اس کے لیے تو طویل جد و جہد کی ضرورت تھی اور ہے ، دوسری ضرورت یہ تھی کہ فن کاروں کو بدلتی ہوئی اقدار سے ہم آہنگ کرنا ۔ انور سجاد نے یہ تحریک ایوب کے دور میں شروع کی تھی جبکہ ثقافت اور فن کے حوالے سے انسان کی پہچان ایک جرم تھی ۔ اُس دور میں تو عام آدمی سوچتے ہوئے ، محض سوچتے ہوئے خوف کھاتا تھا ۔۔۔ انور کا اس وقت یہ نعرہ لگانا خطرے سے خالی نہ تھا ۔ انور سجاد کی سیاسی زندگی پر آج تک کسی نے نہیں لکھا شاید "عصرانہ خطرات" کے پیش نظر کہ ہم جو کچھ کسی کے بارے میں لکھتے ہیں، عہد ہوتا ہے ، عہدنامہ ہوتا ہے ۔

اس جنگ کا نقشا عجیب و غریب ہے ۔ بلکہ غریب زیادہ ہے ، کیونکہ اس سے وابستہ فن کار اسے کوئی اقتصادی تحریک سمجھ رہے تھے ، اُن کے خیال میں اب رزق کی کشادگی ہونے والی ہے ۔ انور سجاد نے پہلا پتھر لاہور آرٹس کونسل پر پھینکا ۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ اُس کی تجربہ گاہ تھی جس کے بعد سے ثقافت کی جنگ کا نقشا ترتیب پاتا تھا ۔ انور کا موقف یہ تھا کہ آرٹس کونسلوں کے انتظامی ڈھانچوں میں خالصتاً فن کاروں کی نمائندگی ہو اور یہ بات بالکل جائز تھی کہ ثقافتی اداروں کا انتظام و انصرام فن کاروں کی بجائے انجنیئروں ، ٹھیکے داروں ، سرمایہ داروں ، جاگیرداروں کے ہاتھ میں ہو ۔ دورِ ایوبیہ میں یہ نعرہ ترقی پسندانہ خیال کا حامی سمجھ کے کچل دیا گیا ۔۔۔ لیکن انور سجاد نے ہمت نہ ہاری وہ یکا و تنہا اس محاذ پر لڑتا رہا ۔ حتیٰ کہ آرٹس کونسلوں میں فن کاروں کی نمائندگی پر لوگوں نے پہلے حیران اور پھر ہنسنا شروع کر دیا ، خود فن کار برادری میں بھی اِس پر اختلاف رائے ہو گیا ۔ کیونکہ جاگیردارانہ سوچ اور پروپیگنڈے کے طابع رہ کر ان کا ردعمل یہی ہو سکتا تھا ۔ ساتھی فنکار یہ کہتے تھے کہ فن کار

محض فن کار ہوتا ہے اُسے انتظامی معاملات سے کیا غرض ـــــ ؟

انور سجاد کہتا تھا کہ یہ پٹرول پمپ والے، ٹافیوں اور جوتے کا کاروبار کرنے والے کس طرح ملک کی ثقافتی پالیسی مرتب کرسکتے ہیں۔ کیا فن کاروں کا کوئی نمائندہ محض اپنی فن کارانہ صلاحیت کی بنا پر ریلوے بورڈ کا ممبر ہے ـــ ؟ اگر نہیں تو اُمرائے شہر کا آرٹس کونسلوں میں دخل کیا معنی ـــ ؟ انور سجاد سمجھتا تھا کہ فن کاروں کی ثقافتی کونسلوں میں نمائندگی محض اس لیے نہیں کہ اُن کے سینے پر لگے تمغوں میں اضافہ ہو یا یہ نمائندگی "اسٹیٹس سمبل" بن کر رہ جائے۔ جیسا کہ یہ امرا طبقے کے لیے تھا کہ جن کی پشت پر پوری کی پوری بیوروکریسی موجود تھی، اس گٹھ جوڑ کو توڑنا آسان مرحلہ نہیں تھا کیونکہ بیوروکریسی اس نمائندگی ـــ کے دانشورانہ خطرات کو سمجھ رہی تھی۔ کیونکہ یہ امرا طبقہ ہی تو اُس پلید فن و ثقافت کا دلال تھا، ان ثقافتی چوپالوں میں فن اور فن کاروں کی جو درگت بنی ہے یہ تو وہی لوگ جانتے ہیں جو اِس جہنم میں عملی طور پر رہے ہیں، تحریک سے باہر کا آدمی محض لفظوں کے کرتب سے کچھ نہیں سمجھاسکتا۔

الغرض ۱۹۶۸ء سے لے کر ۱۹۷۲ء (عوامی دَور) تک کا درمیانی دَور کچھ ایسا تھا کہ انور سجاد کچھ لوگ اکٹھے کرتا جو اگلے چوک تک دشمن کی صفوں میں شامل ہوجاتے۔ واضح جنگ کا آغاز پیپلز پارٹی کے منشور میں کلچر کی حیثیت اور تعین کے بعد ہوا کیونکہ پیپلز پارٹی ہمارے ملک کی واحد سیاسی جماعت ہے جس نے قوموں کی زندگی میں فن و ثقافت کے کردار کو سمجھ کر اسے جائز مقام دیا ـــ ایوبیہ دَور کے خاتمے اور ذوالفقار علی بھٹو کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی انور سجاد نے فن کاروں کی مختلف ٹولیوں کو پھر سے اکٹھا کرنا شروع کردیا اور اِسے باقاعدہ جماعت کی شکل دے ڈالی، اس کا نام "پاکستان آرٹسٹس ایکویٹی" ہے۔ اس میں فنون لطیفہ کے تمام شعبوں کے اداکار، صدا کار، ڈرامہ نویس، مصوّر، رقاص، موسیقار شامل ہیں۔ مختصر لفظوں میں اس جماعت کی ممبرشپ صرف پرفارمنگ اور ویژول آرٹس سے متعلقہ فن کاروں پر کھلی تھی، جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ سوسائٹی میں صدیوں سے پسے ہوئے فن کار کو ٹریڈ یونین کی سطح پر مجتمع کرنا ایک معجزے سے کم نہیں؛ دوسری بات یہ کہ آزاد معاشی گروہ اپنی کوئی بھی ایسوسی ایشن تو بناسکتا ہے مگر ٹریڈ یونین قوانین کے تحت کوئی سرگرمی نہیں کرسکتا۔

انور سجاد نے ہمارے لیے ملکی قانون میں یہ گنجائش پیدا کرائی کہ کانٹریکٹ پر کام کرنے والے فن کار بھی اپنی ٹریڈ یونین بناسکتے ہیں، آرٹسٹس ایکویٹی کو قومی سطح پر آرگنائز کرنے

میں کوئی دو ماہ کا عرصہ لگا۔

پیپلز پارٹی کے برسر اقتدار آتے ہی آرٹس کونسلوں کے انتظامی ڈھانچے توڑ کر فن کاروں کو شامل کیا گیا۔ ہمارے نزدیک یہ کامیابی ثقافت اور فن کی دنیا میں انقلاب کی حیثیت رکھتی ہے، انور سجاد لاہور آرٹس کونسل کے پہلے فن کار چیئرمین تھے، جس روز انور سجاد پہلے روز دفتر آیا تو شہر بھر کے فن کار لاہور آرٹس کونسل میں جمع ہو گئے تھے، یقیناً انور سجاد کی فتح اُن سب کی فتح تھی، ملک بھر کے فن کاروں کے خطوط اور مبارکبادی کے تار علیٰحدہ تھے۔ وہ دن مجھے نہیں بھولتا، عید کا سا سماں تھا۔

اُس کے بعد ملک بھر میں فن و ثقافت کی ترویج کے لیے چھوٹی بڑی کونسلیں قائم کی گئیں لیکن اُن کی اساس وہی تھی جو انور سجاد نے طویل جدوجہد کے بعد قائم کی تھی۔ جونہی کونسلوں کا قیام عمل میں آیا یہ پھر بیوروکریسی کی زد میں آئیں کیونکہ رجعت پسند اس عمل سے خوش نہ تھے اس کے لیے ضروری تھا کہ فن و ثقافت کی علیٰحدہ وزارت ہو۔ انور سجاد ایک بار پھر دربدر خاک بسر ہوا، کوئی محفل ہو کوئی تقریب مگر انور سجاد کی تان وزارتِ ثقافت پر ٹوٹتی یہ مسئلہ بھی جزوی طور پر حل ہو گیا ہے اور اُن لوگوں سے بھی جان چھوٹ گئی ہے جو فن و ثقافت کے ٹھیکے لیا کرتے تھے اور پھر اِس کی آڑ میں، پرمٹ لیا کرتے تھے انور نے کم از کم یہ زنجیر (CHAIN) توڑ دی ہے۔

آج جبکہ میں بیٹھا انور سجاد پر لکھ رہا ہوں تو میرے سامنے وہ بلند قامت بونے ہیں جو اس ساری جدوجہد میں محض خاموش تماشائی تھے، زیرلب بڑبڑاتے تھے یار یہ انور سجاد کو کیا ہو گیا ہے ہر وقت تحریک چلاتا رہتا ہے اور جونہی کونسلوں کا قیام عمل میں آیا تو ملازمتوں کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے۔

ہفتے میں سات روز ہوتے ہیں مگر صاحب کیا مجال ہے کہ انور سجاد کی ملاقات اپنے گھر والوں سے کبھی دن میں ہو جائے رات کو سوتے ہیں، اور صبح کو نیم خوابیدہ اُس کے بعد نہیں۔ میرا خیال ہے انور اپنے گھر میں مہمان کے طور پر رہتا ہے کیونکہ گھر کی اکثر اشیا سے وہ بھی اتنا ہی ناواقف ہے جتنے کہ اور دوست، موصوف کی شادی اپنے خاندان میں ہی ہوئی ہے۔ بیوی کا بیشتر وقت یورپ میں گزرا ہے، مگر شادی سے پہلے، اب نہیں، رتی بھابی گھر کو بہت سلیقے سے سجاتی ہیں، جس کی داد صرف ملازمین سے ملتی ہے کیونکہ انور سجاد تو رات گئے گھر کے

ایک غسل خانے سے داخل ہوتا ہے گھر کا صدر دروازہ تو صبح قانونی طور پر استعمال ہوتا ہے ۔
جمعرات کی شام میں انورسجاد کلینک سے فارغ ہوتا ہے گویا یہ اُن کی سرکاری آدھی چھٹی ہے۔
یہ شام رتی بھابی کے لیے مخصوص ہے اور انورسجاد اس کا اعلان گاہے گاہے دوستوں کی محفل میں
کرتا رہتا ہے کہ بھئی جمعرات کی شام، میری بیوی کی ہے۔ مگر یہ جمعرات کی شام بھی ایک ٹیلیفون
گھر جاتا ہے۔ "جان ایک میٹنگ میں پھنس گیا ہوں ـــــ، ہاں ہاں بھئی کیوں نہیں یہ شام تمھاری
ہے ـــــ بس ایک آدھ گھنٹے تک آرہا ہوں۔ بس تم تیار رہو۔ ہم آتے ہی کہیں کے لیے
چل دیں گے۔ کھانا مت کھانا" وہ بندیِ خدا کپڑے پہنے گھر میں تمام تر نعمتوں کے باوجود فاقے
سے نیم دراز رہتی ہے۔ انور پہنچ کر رتی بھابی کو لے کر نیم خوابیدہ شام منانے کے لیے نکل کھڑا
ہوتا ہے۔ رتی نے بارہا دھندلائی نظروں سے اس شہر کو خواب کی سی صورت میں دیکھا ہے۔ مجھے
یقین ہے کہ اگر رتی بھابی کو کبھی دن میں انھی مقامات پر لے جایا جائے جہاں وہ اکثر جمعرات کی
شامیں گزار چکی ہیں، پہچان نہ سکیں۔ لیکن اس کے باوجود دونوں میاں بیوی میں کوئی چپلقش
نہیں۔ میں نے بھی انور کی دیکھا دیکھی یہی رویہ اپنے ہاں رائج کیا، نوبت طلاق تک پہنچی،
میں تو اس کے بعد معمول پر آگیا مگر انور کے ہاں کامیابی سے چل رہا ہے۔

انورسجاد اپنے دوستوں سے خط و کتابت بڑی ذمہ داری سے کرتے ہیں، اکثر اوقات
ملاقاتیے بور ہوجاتے ہیں کہ یہ شخص ایک غیر پیداواری منصوبے کو کیسی تن دہی سے انجام دے
رہا ہے، میں نے آج تک انور کو کسی رشتہ دار کو خط لکھتے نہیں دیکھا، ہوسکتا ہے انھیں خط
چلتے پھرتے گھسیٹ دینا ہو کیوں کہ اُن میں ذہن کا استعمال کب ہوتا ہے۔؟ دوستوں سے
آئے ہوئے خطوط کئی کئی بار پڑھتا ہے، جب خود مطمئن ہوجاتا ہے تو قریبی دوستوں کو پڑھواتا
ہے یہ خطوط بلراج مین را اور انور عظیم کے ہوتے ہیں، انور عظیم کے خطوط کتابتی اعتبار سے
شکستہ مگر مواد کے اعتبار سے مربوط ہوتے ہیں۔ مین را کے خطوط طویل ـــــ میں نے بارہا
ان تحریروں کو پڑھا ہے ـــــ یا یوں کہیے کہ میں نے دو طرفہ خط و کتابت سے خاصہ مغز حاصل
کیا ہے کہ ان میں تکلف جو نہیں ہوتا، انورسجاد کی بدولت مجھے بھی اُن لوگوں، جن میں باقر
مہدی، انور عظیم اور بلراج مین را شامل ہیں، جو ہندوستان میں نئے انسان کو طلوع کریں گے
کبھی ملاقات کا موقع مل جائے گا۔ ثواب بہ ہر طور انورسجاد کو ہی ہوگا۔
جس طرح انسان ابھی تک تسخیر کائنات نہیں کرسکا ہے، بالکل اسی طرح مجھے بھی تادم تحریر

انور کے اسی قدر علاقے پر فتح حاصل ہوئی ہے جو کچھ کہ میں نے لکھ دیا ہے، کیونکہ انور سجاد روزانہ دریافت ہوتا رہتا ہے ــــ میں نے انور کے ایک اور قریبی دوست سے اس سلسلے میں کچھ مخبری چاہی تھی، اُن کا نام شاہ عنایت ہے تو وہ یکدم سنجیدہ ہوگئے، کہا "مجھے انور کی تحریروں سے انسانی گوشت کی سڑاند، ناممکن خواہشات کی بھبکار آتی ہے۔ بالکل ایسی ہی مجھے اپنے آپ سے آتی ہے، انور سجاد ہمارا، دنیا بھر کے شاہ عنایتوں کا ادیب ہے" شاہ عنایت تقریباً آبدیدہ ہوگئے، مجھے لینے کے دینے پڑ گئے، بڑی مشکل سے انھیں مستقبل کی نوید سنا کر نارمل کیا۔

میرے خیال میں شاہ عنایت انور سجاد کے بارے میں ایک آدھ جملہ کہہ کر میرے پچھلے تمام صفحات پر پانی پھیر گیا، بلکہ پانی پانی کر گیا میں نے اس جملے کو ہی متبرک جان کر خاکے کو یہیں ختم کر دیا کہ یہ تو ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ پہلے تو مجھے شروع کرنے میں ہی دقت ہو رہی تھی ــــ اچھا ــــ۔

○